کالے پیڑوں کا جنگل

(افسانوں کا مجموعہ)

ڈاکٹر ریاض توحیدی

میزان پبلشرز
سرینگر کشمیر

کالے پیڑوں کا جنگل

(افسانوی مجموعہ)

ڈاکٹر ریاض توحیدی

عالمی معیاری کتاب نمبر
ISBN -978-93-80691-30-5

نام کتاب: کالے پیڑوں کا جنگل
مصنف: ڈاکٹر ریاض توحیدی
سال اشاعت ۲۰۱۱
کمپوزنگ ایم، بشارت احمد بابا
سرورق: فیض احمد
قیمت: ۲۰۰ (طلبہ ایڈیشن)
۳۰۰ (لائبریری ایڈیشن)

ناشر
میزان پبلشرز

Title Kale Pedon Ka Jangal
Athar Dr. Riyaz Touheedi
Price: 200/- Student Edition
300/- Liberary Edition
Publishers Meezan Publishers
Opp. Fire & Emergency Services Hqrs
Batamaloo Srinagar 190009 Kashmir
Ph: 2470851 Fax- 0194-2457215 Cell: 9419002212
Email- meezanpublishers@rediffmail.com

زیر اہتمام
شبیر احمد

فہرست



انتساب

وادیٔ گلپوش کے اُن سینکڑوں

"گلوں"

کے نام

جن پر کئی موسموں سے خزاں کے سیاہ سایئے

منڈلا رہے ہیں۔

پیش لفظ

ریاست جموں و کشمیر میں افسانہ نگاری کی روایت کو تقسیم ملک کے بعد ایک نئی شکل وصورت مل گئی اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نئے افسانہ نگاروں کی آمد سے یہ روایت مضبوط سے مضبوط تر چلی جارہی ہے۔ اس وقت بھی یہاں ایسے افسانہ نگاروں کی کمی نہیں جو اس صنف کو ارتقاء بخشنے کے لئے اپنا رول خوش اسلوبی سے نبھارہے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج یہاں کا افسانہ نگار عشقیہ کہانیوں سے دور ہوکر زمینی حقیقتوں کو اُجاگر کررہا ہے، زمینی مسائل واضح کررہا ہے۔ استحصال کی بدترین صورتوں کے خلاف جنگ لڑرہا ہے۔ وہ آج کے انسان کی پامالیوں کی بات کرتا ہے، خواتین کی عظمت اور بچوں کی معصومیت کو اپنے افسانوں کا پس منظر بناکر ایک نئے افسانے کی تخلیق کررہا ہے۔ وہ کھوئی ہوئی قدروں کی بازیافی کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسانی قدریں اپنا وجود کھورہی ہیں، ہر سمت ہیجان اور انتشار بکھرا ہوا ہے۔ انسانی تہذیب وتمدن کا خاتمہ ہورہا ہے۔ آج یہاں کا قلم کار زندگی کا زہر گھول گھول کر پی رہا ہے اور پھر بھی زندہ رہنے کی کوشش کررہا ہے...... اِس پس منظر میں کشمیر کے افسانوی ادب میں

جو نئے نام سامنے آرہے ہیں ان میں ڈاکٹر ریاض توحیدی بھی شامل ہیں۔

افسانوی ادب میں ڈاکٹر ریاض توحیدی کی عمر زیادہ نہیں۔ اُن کا پہلا افسانہ ''قتل، قاتل اور مقتول'' کشمیر سے شائع ہونے والے معروف اور مؤقر اخبار کشمیر عظمیٰ میں اپریل 2005 عیسوی میں شائع ہوا۔ تب سے وہ برابر کہانیاں لکھتے جارہے ہیں اور اُن کی کہانیاں نہ صرف مقامی اخباروں بلکہ کشمیر اور بیرون کشمیر سے شائع ہونے والے رسائل میں بھی شائع ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی آپ اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ اپنے پڑھنے والوں کی نذر کر رہے ہیں، مجموعے کا عنوان ہے...... کالے پیڑوں کا جنگل...... بظاہر یہ عنواں کسی Abstract پینٹنگ کی طرح نظر آرہا ہے لیکن مجموعے میں شامل کہانیاں پڑھ کر آپ کو اِس عنوان کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی نے اپنی تخلیقی سر گرمیوں کا آغاز اس وقت کیا جب کشمیر پُر آشوپ دور سے گذر رہا تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ اس دور کے بہت سارے حالات، واقعات اور بہت ساری باتیں ان کے ذہن میں جگہ بنا گئیں اور جب انہیں افسانہ لکھنے کی تحریک ملی تو اس دور کی بہت سی باتیں اُن کے افسانوں میں ظاہر ہونے لگیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کی اب تک کی تحریر کردہ اکثر کہانیوں میں درد و کرب' خون خرابہ اور ٹوٹتی ہوئی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس تعلق سے مجموعے میں شامل اُن کی کہانیاں قتل، قاتل اور مقتول، ناکہ بندی، ہوم لینڈ اور مسائل کے یزید قابل ذکر ہیں۔ ان کی اکثر کہانیوں کے کردار انسانی زندگی کی تلخیوں، الجھنوں اور ناکامیوں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ بہتر اور خوشحال مستقبل کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ رنج و غم کی داستانوں میں وہ چراغ جلا جلا کر انسانی دلوں کی تاریکیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ آپسی بھائی چارہ پر زور دیتے ہیں......!

اُن کی ایک کہانی ہوم لینڈ سے ایک اقتباس......

"عبداللہ خان، سوم ناتھ اور سر جیت سنگھ ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کی پائیدار علامت تھے۔ اِن لوگوں نے زندگی کی ستر بہاریں دیکھ لی تھیں، یہ ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے اور زمانے کی نشیب و فراز میں یہ لوگ اتحاد و اتفاق کی ایک بے مثل علامت تھے۔ الگ الگ مذہبوں سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ لوگ ایک ہی کنویں سے پانی پیتے تھے، ایک ہی کھیوٹ سے فصل اگاتے تھے۔ گاؤں میں ایک بہت بڑا صدیوں پرانا چنار تھا، یہ تینوں اس چنار کے سائے میں غم روزگار پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ یہ چنار اس علاقے کے لوگوں کا صدیوں پرانا ورثہ تھا جب بھی بستی میں بدامنی کا کوئی واقعہ پیش آتا تو بستی کے لوگ مِل جُل کر اس چنار کے سائے میں بیٹھ کر بدامنی کو امن میں تبدیل کرتے تھے۔"

(ہوم لینڈ)

کہانی کے تین کردار، تین فرقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کہانی میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کشمیر میں رہنے والے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان صدیوں سے چلے آرہے بھائی چارہ کو کیسے اور کن سازشوں کا شکار ہونا پڑا۔

ریاض توحیدی کا اصل نام ریاض احمد بٹ ہے لیکن وہ ریاض توحیدی کے نام سے لکھتے ہیں، وہ ضلع کپواڑہ کے تحصیل ہندوارہ کے ایک گاؤں وڑی پورہ میں یکم دسمبر 1973 عیسوی کو پیدا ہوئے۔ پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک گورنمنٹ ہائی سکول وڑی پورہ میں تعلیم حاصل کی، انٹرمیڈیٹ کا امتحان گورنمنٹ ہائر سکینڈری سکول ہندوارہ سے پاس کیا۔ گورنمنٹ ڈگری کالج ہندوارہ سے 1999 عیسوی میں بی، اے کیا۔ 2002 عیسوی میں کشمیر یونیورسٹی سے ایم، اے اردو کی ڈگری حاصل کی

2004 عیسوی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سے ایم ،فل کی ڈگری پائی۔ تحقیقی مقالہ کا موضوع تھا پروفیسر حامدی کاشمیری بحیثیت اقبال شناس اور اس کے بعد 2007 عیسوی میں پی ، ایچ ، ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ موضوع تھا ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی اقبال شناسی۔ اِن دنوں بحیثیت لیکچرر محکمہ تعلیم میں کام کر رہے ہیں۔

''کالے پیڑوں کا جنگل'' میں اکیس کہانیاں شامل ہیں۔ اپنے افسانوں میں وہ کبھی کبھار علامتوں کا بھی سہارا لیتے ہیں لیکن اِن علامتوں میں کوئی الجھاؤ محسوس نہیں ہوتا ہے......

سفید ہاتھیوں کا یہ وحشی قافلہ عرصہ دراز سے اُن پر حملہ آور ہوا تھا۔ یہ درندہ صفت قافلہ اس جمادات نما مخلوق کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ بڑے غور سے سفید ہاتھیوں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ ان حملہ آور ہاتھیوں کے پیچھے قُقنُس کا مسحور کن ساز بج رہا ہے اور اِس ساز کی بدلتی رہتی آوازیں ان ہاتھیوں کی وحشیانہ سوچ پر اثر انداز ہو رہی ہیں، ان کے وحشیانہ جذبات کو بھڑکا رہی ہیں اور اِن کو اپنے مقاصد کو پورا کرنے تک متحد رہنے کی صدائیں دے رہی ہیں......!! (سفید ہاتھی)

اور جب ڈاکٹر توحیدی کشمیر کے موجودہ درد و کرب کی باتیں کرتے ہیں تو پڑھنے والے کا وجود لرز لرز جاتا ہے۔

''پندرہ برس کا طالب علم گلستان خان جب بھی اس شبِ سُرخاب کی طوفانی طغیانی میں اپنی غمگین سوچ کو نیند کے تلخ سمندر میں ڈبونا چاہتا تھا تو ان ہی کرب زدہ لمحوں میں ان ستیزہ چشم بھگت باز درندوں کی آگ برساتی گولیوں کا وہ دہشت ناک خونین منظر زلزلہ بن کر اُس کے نازک ذہن کی

نازک سوچوں اور اس کے شیشۂ دل کے حسین سپنوں کو چکنا چور کر کے رکھ دیتا تھا، جس میں اس کے سامنے، دن کے اُجالے میں، اُس کے سولہا برس کے معصوم دوست بوستان شاہ کے نرم و نازک گلابی بدن کو سیاہ پوش درندوں کی زہریلی گولیوں نے پرزہ پرزہ کر کے رکھ دیا تھا اور اُس کا معصوم دوست موت کی گولیاں کھاتے کھاتے خون آلودہ ہاتھوں سے اپنے اسکولی بیگ سے کتابیں دکھا دکھا کر ان سنگ دل جلادوں کو اپنی بے گناہی کا نا کام وشواس دلا رہا تھا......!" (مصلوب دھڑکنیں)

میں ڈاکٹر ریاض توحیدی کو کشمیر کے افسانوی ادب کی دنیا میں استقبال کرتا ہوں......!

22 رفروری 2011 نور شاہ
سرینگر



چند باتیں

وہاں پہ جشن بہاراں عجیب لگتا ہے
جہاں جلائی گئیں بستیاں گلابوں کی
کہیں پناہ نہ پائے گی ظلمت دوراں
زمین پہ فصل اُگے گی پھر آفتابوں کی

(ابوالمجاہد زاہد)

افسانوی سفر......سوچ کی پرواز کا تخیلی سفر ہوتا ہے۔ یہ سفر ذاتی تجربے، خارجی مشاہدے اور قوت تخیل کے وسیلے سے جاری رہتا ہے۔ انسان کی زندگی بذاتِ خود ایک کہانی ہے۔ یہ کہانی پیدائش سے لے کر موت تک کے سفر پر مشتمل ہوتی ہے۔ انسان سے ہی قوم بنتی ہے اس لئے قوموں کی بھی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے جوان کے عروج و زوال پر مبنی ہوتی ہے۔ جدید دنیا میں غالباً کشمیری قوم ہی وہ واحد قوم ہے جس کے عروج وزوال کا فیصلہ غیروں کے ہاتھوں انجام پاتا آیا ہے، کبھی اسے بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کیا گیا اور کبھی اسے ذاتی جائیداد سمجھ کر منقسم کیا گیا۔ اس طرح سے اس مظلوم قوم کی ایک درد بھری کہانی تاریخ عالم میں رقم ہوتی گئی۔ اس کتاب میں شامل میری بیشتر کہانیاں میری اس ستم رسیدہ قوم کی آہوں اور سسکیوں کی المناک داستان سُنا رہی ہیں۔

بہر حال مین ان تمام مفکروں ، معلموں ، محبوں اور دوستوں کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ جنہوں نے وقتاً فوقتاً مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا، خصوصاً ممتاز افسانہ نگار جناب نور شاہ صاحب کا میں دل کی عمیق گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ موصوف ہمیشہ مخلصانہ رہنمائی سے مجھے نوازتے رہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ محترم قارئین کتاب کا مطالعہ کر کے مجھے اپنی رائے سے نوازے گے۔

طالب راہ

ریاض توحیدی

ماں

وہ اوندھے منہ زمین پر گر کر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ جن بچوں کے ساتھ وہ کھیل کود میں مشغول تھا وہ دوڑتے ہوئے اُس کے گھر گئے اور اُس کی ماں کو ساتھ لے آئے۔ ماں نے جب روتے روتے اپنے دوپٹے سے اس کے جھاگ بھرے منہ کو صاف کیا تو وہ تھوڑی دیر بعد پھر سے اپنے حواس میں آ گیا۔ ماں اُسے گھر لے آئی اور کھانا کھلاتے ہوئے سمجھانے لگی کہ کتنی بار تجھ سے کہا کہ گھر سے باہر مت نکلا کر، ابھی تو ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ جب اچھی طرح ٹھیک ہو جائے گا تو تو بچوں کے ساتھ کھیل بھی سکے گا۔ اُس پر ماں کی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا تھا وہ اپنی بیماری سے بے خبر تھا۔ اُسے جب بھی مرگی کا دورہ پڑتا تھا تو اُس کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو جاتا اور وہ زمین پر گر کر ہاتھ پاؤں سے زمین کھودنے لگتا۔ وہ بیس برس کا ہونے کے باوجود بھی بچہ تھا اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا رہتا۔ اور جب وہ کبھی دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے گھر نہیں جاتا تو اُس کی ماں اسے ڈھونڈتی ہوئی کھیل کی جگہ پہنچ جاتی اور اُسے بازو پکڑ کر گھر لے جاتی۔ دیہاتی ہونے کی وجہ سے اُس کے والدین نے اُس کی بیماری کی

طرف کم ہی توجہ دی۔ وہ پیروں، فقیروں کے پاس تو جاتے تھے لیکن اس کا میڈیکل علاج نہیں کرواتے تھے لیکن وہ لوگ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے تھے کیونکہ اُس دور دراز دیہات میں شاید ہی کوئی انسان جدید طریقہ علاج سے آشنا تھا۔ وہاں پر نہ تو کوئی ہیلتھ سنٹر تھا اور نہ ہی کوئی فرد جدید میڈیکل سہولیات سے واقف تھا۔ یہ لوگ روایتی انداز میں بیماریوں کا علاج کرنے کے عادی تھے۔ ان لوگوں کے اکثر بچے پولیو اور ٹی، بی جیسی مہلک بیماریوں کے شکار ہوجاتے تھے۔ توہمات اور لاعلمی کی وجہ سے یہ لوگ ان بیماریوں کی جانب کم ہی توجہ دیتے تھے۔

تہوار کی صبح والدین نے اُسے نہلایا اور نئے کپڑے پہنائے، وہ کھانا کھا کر بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے میدان کی طرف چل پڑا۔ میدان میں ڈھول بج رہے تھے۔ بچے ڈھول کی نال پر ناچ رہے تھے۔ وہ بھی ناچنے لگا اور ناچتے ناچتے اپنے کپڑے پھاڑنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں اُس پر مرگی کا دورہ پڑا اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ کچھ لوگوں نے اُسے زمین سے اٹھایا اور اُس کے گھر کی طرف لے چلے۔ گاؤں کا ایک لڑکا، جو شہر میں پڑھ رہا تھا بھی اُس کے گھر چلا گیا۔ وہاں اُس نے اُس کے گھر والوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ شہر جا کر کسی اچھے ڈاکٹر سے اس کا علاج کرائے۔ کچھ دنوں کے بعد اُس کے والدین اُس لڑکے کے ساتھ شہر کے ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس اُسے لے گئے۔ ڈاکٹر نے جب اسکا مکمل چک اپ کیا تو وہ مایوس ہو کر انھیں سمجھانے لگا کہ آپ لوگ بڑی دیر سے آئے۔ اس کے سر کی نسیں کمزور پڑ گئی ہیں اور یہ نشانی پاگل پن کی نشانی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نے انھیں معمولی دوائیاں لکھ کر دیں اور رہ وہ مایوس ہو کر گھر کی طرف لوٹ پڑے۔ ماں اب اُسے گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتی تھی۔ اُس پر اب مہینے میں تین چار بار پاگل پن کا دورہ پڑتا۔ دوا کا بھی اُس پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوتا تھا۔ ماں

ہر طرح سے اُسکا خیال رکھتی تھی۔ لیکن جب وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لینے لگی تو اُس نے اپنے دوسرے بیٹوں سے منت سماجت کی کہ وہ اپنے نیم پاگل بھائی کو کسی قسم کا دُکھ نہیں دینگے۔

ماں کے مرنے کے بعد اُس کی چھوٹی بہن اُس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ وہ اُس کے کپڑے دھوتی، اُسے صاف رکھتی اور وقت پر اُسے کھانا کھلاتی رہتی۔ بہن کی شادی کے بعد وہ اکیلا پڑ گیا۔ بھائیوں نے جب شادیاں کیں تو وہ اُس کی طرف کم ہی توجہ کرنے لگے۔ ایک دن گھر کا بٹوارہ ہو گیا۔ بھابیوں نے الگ الگ چولہے جلائے۔ گھر کی تمام قیمتی جائیداد کی تقسیم تو ہو گی لیکن اس بے قیمت شئے کو کسی نے بھی نہیں اپنایا۔ اُس کو بکریوں کے اندھیرے جھونپڑے میں رکھا گیا اور اپنی اپنی باری پر اُسے کھانا دیا جاتا۔

تہوار کا دن تھا۔ ہر طرف خوشی کا ماحول تھا۔ اُس کی بھابیاں طرح طرح کے لذیذ کھانے اپنے بچوں کو کھلاتیں رہی۔ اُس کی طرف کسی کا بھی دھیان نہیں چلا گیا۔ وہ دن بھر بھوکا پیاسا اندھیرے میں پڑا رہا۔ جب اُسے بھوک نے زیادہ ستانا شروع کیا تو اُس نے بکری کے تھن سے اپنا منہ لگایا اور دودھ پینا شروع کر دیا۔ اس کچے دودھ کی وجہ سے اُسے بخار چڑھ گیا اور اس کا بدن جلنے لگا۔ رات کے وقت جب اُس کی ایک بھابی بکری کا دودھ دوہنے آئی تو تھن خالی پا کر اُس نے فرش پر دودھ کی چھینٹیں دیکھی۔ اُس کے نزدیک جا کر جب اُس نے سمجھا کہ دودھ کہاں غائب ہو گیا ہے تو اُس نے غصے میں آکر بالٹین اُس کے سر پر زور سے مارا اور بک بک کرتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔ اس نیم پاگل کے سر سے خون بہنے لگا۔ آدھی رات تک وہ زخمی حالت میں تڑپتا رہا اور جب سب لوگ سوئے ہوئے تھے تو اُس پر پاگل پن کا دورہ

پڑنے لگا۔ وہ اندھیری رات میں قبرستان کی طرف کپڑے پھاڑتے ہوئے چلا گیا۔ ماں کی قبر پر پہنچ کر وہ زور زور سے رونے لگا۔ وہ اپنی زخمی روح کو سکون دینے کے لئے ماں کی قبر سے لپٹ گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ بچپن کی طرح ماں کی گود میں بیٹھا ہوا ہے اور ماں اُسے سُلانے کے لئے لوری سُنا رہی ہے۔ اُس پر آہستہ آہستہ نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کے ہاتھ پیر ہلنے لگے اور دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ اُس کی آنکھیں اچانک کھل گئیں اور اُس کے منہ سے جھاگ کے ساتھ آخری بار نکل پڑا...... ماں............!!



گلوبل جھوٹ

"ذہنِ انسانی، احساس کی سرد و گرم لہروں سے ہی غور و فکر کے ساحلوں سے ٹکراتا رہتا ہے" وہ سنجیدگی سے میرے سوال کا جواب دے رہا تھا "اور فکری سطح پر انسان، احساس برتری کی گرمی یا احساس کمتری کی سردی کا اسیر رہتا ہے۔"

"آج پھر تیرے فلسفیانہ افکار کے بار نے میری ناتواں سوچ کو داب کر رکھ دیا" میں نے اُسے مذاقاً چھیڑا۔ "میرا سوال تو آسان تھا"

"نہیں! انٹرنیٹ مائنڈ...... تم کسی بڑے مسئلے کو بھی خارجی سطح پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہو۔" اُس نے دھیمے لہجے میں کہا "جب قوموں کے اتار چڑھاؤ کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس پر دو اور دو کا چار والا ریاضی فارمولہ نہیں چلتا ہے بلکہ اس کے لئے داخلی سطح پر سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

ہمارے درمیان جب بھی کسی مسئلہ پر گفت و شنید ہوتی رہتی ہے تو میرا فلسفی دوست، ایوان فلسفہ کی بلندی سے اپنے سرد و گرم افکار کی ہوائیں چھوڑتا رہتا ہے اور مجھے اس کے حکیمانہ نقطوں کی تہہ تک پہنچنے کے لئے فکر کی کئی سرحدوں کو پھاندنا پڑتا

ہے۔ ''فخر کرنے کے اعتبار سے ہم لوگ اگر چہ دوسرے لوگوں سے کئی قدم آگے ہیں'' میں نے ایک حساس سوال اُس کے سامنے رکھ دیا ''تو پھر ہم کیوں دنیا کے گوشے گوشے میں احساس کمتری کے شکار نظر آرہے ہیں۔''

''ہم لوگ حال کو بھول کر ماضی پر فخر کرتے ہوئے اپنے مستقبل کو بھی فراموش کر رہے ہیں''۔ وہ میری طرف سے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بول پڑا۔ ''موجودہ دور کی دھماکہ خیز علمی دنیا میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے کے لئے سادگی کے ساتھ ساتھ چالاکی اور بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کی بھی ضرورت ہے' نہیں تو سادہ ذہن انسان نئے دور کے خیر و شر اور مکر و فریب کی نئی نئی اصطلاحوں کے امتیاز سے قاصر رہے گا۔'' اُس کی یہ فکر انگیز باتیں سنتے سنتے میں نے چائے کی پیالی اُس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا کہ احساسِ کمتری کے اس دلدل سے نکلنے کے لئے کونسی کمند کارگر رہے گی؟ ''ہمارے ذہن تقلید پسندی کے اسیر ہو چکے ہیں'' وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے گویا ہوا۔ ''ہماری سوچ پر جمود چھایا ہوا ہے ہمیں اجتہادی فکر اور متحرک سوچ سے کام لینا پڑے گا۔'' اُس کی یہ تجسس آمیز باتیں سُن کر میں سوچنے لگا کہ کسی معاملے کو بہترین طریقے سے سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اُس معاملے کے متعلق اُسی انسان سے صلح مشورہ کرنا چاہئے۔ جو معاملہ فہم ہونے کے ساتھ ساتھ اُس معاملے کے تمام پہلوؤں کا گہر ! شعور رکھتا ہو۔ نہیں تو اناڑی سوچ کا حامل انسان اناڑی مشوروں سے ہی نوازے گا۔

اُس کی دل پذیر باتوں نے میرے ذہن کے دروازے کھول دیئے اور میں خیالات کے سمندر میں غرق ہو گیا کہ ہم ایک درخشاں تہذیب کی پروردہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں ہمارا تابناک ماضی دوسرے اقوام کے لئے نشانِ راہ ثابت ہوا تھا اور وہ

ڈارک ایج سے نکل کر برائٹ ایج میں آ پہنچے، برعکس اس کے ہم برائٹ ایج کے بنیاد گزار ہونے کے باوجود فکری طور پر ڈارک ایج میں بسنے والوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ہم مفتوح ...... ہماری سوچ مفتوح ...... اور کرمپو مائزڑ سوچ والے انسان بھی فکری مفلسی کا شکار نظر آ رہے ہیں۔

اُس نے مجھے خیالات میں غرق پا کر آواز دی ''کہاں کھو گئے؟'' اُس کی آواز سن کر میں چونک گیا اور اُسے کہنے لگا کہ میں سوچ رہا ہوں کہ ''ہم اپنی کمزوریوں کو کب سمجھنے اور انھیں دور کرنے کی کوشش کرینگے؟'' ''تم کن کمزوریوں کی بات کر رہے ہو؟'' وہ پوچھ بیٹھا۔ ''ہمیں ہر طرح سے دبایا جا رہا ہے۔'' میں بے قراری میں کہہ اٹھا ''ہمیں روز بہ روز کمزور بنایا جا رہا ہے۔'' وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر کہنے لگا۔ ''تم جس حقیقت کو کمزوری سمجھ رہے ہو وہ اصل میں ہماری خامیاں ہیں۔'' ''ہماری خامیاں'' میں حیران ہو کر بول پڑا۔ ''وہ کیسے؟'' ''ہمارے آفاقی دستور میں ہمیں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند متحد رہنے کا اصول بتایا گیا ہے اور ہم ہر جگہ فرقوں...... مسلکوں اور انانیت کے تباہ شدہ کھنڈروں میں پھنسے ہوئے ہیں'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔

''ہم نے آفاقی پیغام کا مغز چھوڑ کر صرف چھلکے بانٹنے میں ہی اپنی سوچ اور طاقت کو لگا دیا ہے۔ اور ہر گروہ عصری تقاضوں سے بے خبر اپنے حصّے کے چھلکے کو اصلی مغز قرار دے رہا ہے۔''

اُس کی حکیمانہ باتوں سے میرے ذہن پر پڑے بے خبری کے دبیز پردے آہستہ آہستہ چاک ہونے لگے۔ ''اس اندھیرے سے نکلنے کی کوئی روشن کرن بھی موجود ہے۔'' میں استفہامیہ انداز سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''ہاں'' وہ ہاتھوں کو اوپر

اٹھا۔تے ہوئے پکار اٹھا"ہمیں اپنے اردگرد چھائے ہوئے جمودی غلاف کو اجتہادی تلوار سے پھاڑ ڈالنا ہوگا اور متحد ہو کر متحرک سوچ کے ساتھ آگے قدم بڑھانا ہوگا۔"
اس وقت تو عالمی سطح پر چند دماغ اس مقصد کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔"میں نے سنجیدگی کے انداز میں کہا"لیکن انھیں دہشت گرد یا دہشت پسند جیسے القاب سے نوازا جارہا ہے۔"

"جس جدوجہد کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو وہ نیند میں چلنے جیسا عمل ہے۔"وہ کرسی پر بیٹھ کر مجھے سمجھانے لگا۔"لیکن اس جدوجہد کے پیچھے بڑے باخبر اور ہوشیار ذہن کام کر رہے ہیں تاہم اس تحریک سے وابستہ زیادہ تر افراد فکر و تدبر سے عاری صرف جذباتی سوچ کے حامل دکھائی دے رہے ہیں۔اس تحریک کو فکر و تدبر کے ساتھ آگے بڑھانے کی ضرورت ہے اور عصری تقاضوں کے مطابق زندگی کے ہر شعبے میں سبقت لینے کی ضرورت ہے۔"وہ چند منٹ خاموش رہنے کے بعد میرے سوال کے دوسرے حصّے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"اور تم یہ جو"دہشت گردی" کی جدید اصطلاح کی بات کر رہے ہو۔"اصل میں یہ عصر حاضر کے طاقت ور حیوانوں کا ایک ایسا گلابل جھوٹ ہے جسے وہ جمہوریت کے فروغ کے بہانے مصنوعی سچ بنا کر بیدار ذہن انسانوں کی بیداری پر روک لگانے کے لئے استعمال کر رہے ہیں تاکہ وہ اپنے بے لگام پاور کی دہشت گردی سے دنیا کے کمزور اور بے بس انسانوں کو جمہوریت پسند غلام بنا سکیں۔"



مصلوب دھڑکنیں

شُترِ بے مہار کی گھنٹی کی ڈراونی آواز نے پھر اُس کے کان کے پردوں کو پھاڑتے ہوئے، اُس کی خوف زدہ نیند پر شبخون مار کر، اُس کے سکون بھرے گھروندے کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ شب دیجور کے بھیانک سائے میں "ماں! ان ظالموں نے اُسے گولی ماردی...... وہ زخمی حالت میں سڑک پر اُن سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے...... ماں وہ تڑپ تڑپ کر رو رہا ہے...... ماں وہ بے بسی کی حالت میں جان دے رہا ہے......" کہتے ہوئے گلستان اپنے بستر سے گھبرایا ہوا اٹھا اور ماں کی چھاتی پر سر مار مار کر سسکیاں لینے لگا۔ ماں کی نیند اچانک ٹوٹ گئی۔ "گھبراؤ مت میرے لال، گھبراؤ مت! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا" کہتے ہوئے وہ خود بھی رو پڑی اور "ہمارا خدا ان قاتلوں سے تمہارے معصوم دوست کے قتل کا بدلہ ضرور لے گا" کا دلاسہ دیتی ہوئی آنسو بہاتے بہاتے اُس کے سر کو اپنے شفقت بھرے ہاتھ سے ستارۂ سحری تک سہلاتی رہی۔

پندرہ برس کا طالبِ علم گلستان خان جب بھی اس شبِ سُرخاب کی طوفانی

طغیانی میں اپنی غمگین سوچ کو نیند کے تلخ سمندر میں ڈبونا چاہتا تھا تو ان ہی کرب زدہ لمحوں میں ان ستیزۂ چشم بھگت باز درندوں کی آگ برساتی گولیوں کا وہ دہشت ناک خونین منظر خوفناک زلزلہ بن کر اُس کے نازک ذہن کی نازک سوچوں اور اس کے شیشۂ دل کے حسین سپنوں کو چکنا چور کر کے رکھ دیتا تھا، جس میں اُس کے سامنے، دن کے اُجالے میں، اُس کے سولہا برس کے معصوم دوست بوستان شاہ کے نرم و نازک گلابی بدن کو سیاہ پوش درندوں کی زہریلی گولیوں نے پرزہ پرزہ کر کے رکھ دیا تھا، اور اُس کا معصوم دوست موت کی گولیاں کھاتے کھاتے خون آلودہ ہاتھوں سے اپنے اسکولی بیگ سے کتابیں دکھا دکھا کر ان سنگ دل جلادوں کو اپنی بے گناہی کا نا کام وشواش دلا رہا تھا۔

پچھلی دو دہائیوں سے جنت کشمیر کے نہ جانے کتنے ہی خوشبو دار پھول، معصوم بوستان شاہ کی طرح آبدیدہ نگاہوں میں سجائے ہوئے رنگ برنگے خوابوں کی تعبیر دیکھے بغیر ہی اپنی تلخ بھری یادیں وطن کی شبنمی پلکوں پر چُبھتے کانٹوں کی طرح چھوڑ کر چلے گئے، اور نہ جانے اور کتنے ہی زاہد اور عنایت جیسے گلابی پھولوں کو، وہ سیاہ بخت جابر گلچیں، کھلنے سے پہلے ہی مسل کر رکھ دینگے، اور اس وادی گلپوش کے چہکتے بلبلوں کی مترنم آوازوں کو کاٹ کاٹ کر، ان کی مصلوب دھڑکنوں میں ہی دفن کرتے رہینگے۔

گلستان اور بوستان ایک ہی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ ہم جماعت اور ہم مزاج ہونے کی بدولت دونوں میں مثالی دوستی قائم تھی۔ گلستان کا خواب ڈاکٹر بننے کا تھا اور بوستان انجینئر بننے کا سپنہ دیکھتا رہتا تھا۔ ایک روز یوم امن منانے کے دن پر امن گروپ کی طرف سے، اسکول کے احاطے میں ”گڈ وِل“ پروگرام کے تحت اسکول کے طالب علموں کے لئے ایک سیمنار کا اہتمام کیا گیا جس کا موضوع تھا، ”میری زندگی کا مقصد“۔ دوسرے طالب علموں کے ساتھ ساتھ گلستان خان اور بوستان شاہ نے بھی

تقریب میں حصہ لیا۔ امن گروپ کے علاوہ سمینار میں دوسرے لوگ بھی طلبہ کی تقریریں دلچسپی سے سُن رہے تھے۔ گلستان خان نے موضوع کی مناسبت سے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''میری زندگی کا مقصد ڈاکٹر بننے کا ہے تاکہ میں اپنی قوم کے ان ہزاروں زخمی افراد کا علاج کرسکوں جو رواں تشدد کی وجہ سے اپاہج بن گئے ہیں۔'' اس طرح سے بوستان شاہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ ایک انجینئر بننے کا خواب دیکھ رہا ہے تاکہ وہ ان اپاہج افراد کے تباہ شدہ مکانون کو دوبارہ تعمیر کرا سکے جنہیں تشدد کی آگ نے راکھ کا ڈھیر بنا ڈالا ہے۔'' دونوں دوستوں کی مثبت تقریروں پر اگرچہ لوگ خوش ہو کر تالیاں بجاتے رہے تاہم امن گروپ کی بدامن آنکھوں میں سُرخی چھا گئی، سمینار کے اختتام پر گلستان اور بوستان کو بہترین کارکردگی دکھانے پر ''امن گروپ'' کی طرف سے ''تلاش امن'' نامی کتاب سے نوازا گیا۔

تقریب ختم ہونے کے بعد دونوں دوست پُر مسرت موڈ میں گھر کی جانب نکل پڑے۔ سڑک پار کرتے ہی گلستان نے بوستان سے کہا کہ تم یہاں پر ہی انتظار کرو میں دوکان سے چاکلیٹ لاتا ہوں۔ وہ ابھی چاکلیٹ ہی خرید رہا تھا کہ اچانک بغیر نمبر کی ایک سبز رنگ گاڑی بوستان کے نزدیک آکر ٹھہر گئی اور چند نقاب پوش گاڑی سے اتر کر بوستان پر گولیاں چلانے لگے، بوستان گولیاں لگنے سے سڑک پر گر پڑا۔ یہ خونین منظر دیکھ کر جب لوگوں نے نقاب پوشوں سے گولیاں چلانے کا سبب پوچھا تو انھوں نے اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے پتھر دکھاتے ہوئے کہا ''یہ ہم پر سنگ باری کر رہا تھا ......سنگ باز سالہ'' اُن کا جھوٹ سنتے ہی بوستان نے جان دیتے ہوئے اپنے اسکولی بیگ سے کتابیں نکال نکال کر کہا کہ ''میرے بیگ میں صرف کتابیں ہیں، پتھر نہیں ......میں بے قصور ہوں......!''

لوگ جب بوستان کی لاش اٹھا کر حاکم الوقت کے مصنوعی دربار میں انصاف کی گھنٹی بجانے لگے تو ڈیوڑھی پر تعینات حاکم کے وفادار کارندوں نے انھیں یہ کہہ کر وہاں سے بھگایا کہ ہماری عدالت کے انصاف کے ترازو میں کتابوں کے پلڑے کے اوپر پتھروں بھرا پلڑا بھاری پڑ گیا۔ لوگ مایوس ہو کر بوستان شاہ کی لاش لے کر خاموشی کے ساتھ قبرستان کی جانب چل پڑے۔ وہ قبرستان، جس پر کسی ظالم کا زور نہیں چلتا تھا اور جو دو دہائیوں سے خاموشی کے ساتھ سینکڑوں مظلوموں کی لاشوں کو اپنی کشادہ گود میں سُلاتے آیا تھا۔

سالانہ امتحان شروع ہونے والا تھا۔ گلستان خان بھی بددلی کے ساتھ امتحان حال میں بیٹھ گیا۔ اُس کے سامنے جب دسویں جماعت کا امتحانی پرچہ ڈالا گیا تو کمرے میں ہر طرف اُس کے دوست کی پرانی آوازوں سے اُس کے کان بجنے لگے۔ وہ آوازیں اُسے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ دوست ہمیں سخت امتحان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم ضرور کامیاب ہو جائینگے۔ تمہیں ڈاکٹر بننا ہے اور مجھے انجینئر۔ گلستان کے اندر عجیب قسم کی بے قراری پیدا ہوئی۔ اُس کے ذہن نے سوچنا بند کر دیا۔

اُسے ہر طرف خون آلودہ پتھر نظر آنے لگے۔ وہ خاموشی کے ساتھ امتحان حال سے باہر چلا آیا اور ''تلاش امن'' نامی کتاب میں پتھر چھپا کر سڑک کے اور دوڑ پڑا۔ شُتر کمینہ کی گھنٹی بجتے ہی اُس کے کان بجنے لگے۔ نوکیلے پتھر کی چوٹ سے امن گروپ کے سردار کے سیاہ ماتھے سے سُرخیلے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ نفرت کی تیز لہر نے بندوق کا گھوڑا دبایا اور آن کی آن میں گلستان کا گلابی بدن برستے شعلوں سے جلنے لگا۔ وہ اپنے جلتے وجود کی پروا کئے بغیر غیرت کے گھوڑے پر سوار ہوا اور امن گروپ کے سردار کے جلادی چہرے پر ''تلاش امن'' نامی کتاب زور سے مارتے ہوئے بول پڑا۔

"مکار...... دھوکے باز...... کیا یہی ہے تمہارا فلسفۂ امن......؟ کہ نہتے لوگوں کی فریادی سانسوں کو تشدد کی ننگی تلوار سے کاٹا جائے......اور......ان کے مضروب دل کی مجبور دھڑکنوں کو پھانسی کے پھندے سے جکڑ دیا جائے......!"

خون بہتے بہتے اُس کے جذبات سرد پڑ گئے اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے سڑک کے بیچوں بیچ زخمی حالت میں گر پڑا۔ بچوں نے جب گولیوں کی مانوس آواز سنی تو انھیں اپنی کتابوں میں لفظوں کے بدلے پتھر ہی پتھر نظر آنے لگے۔ وہ اسکول سے نکل کر بھاری بھاری بیگ ہاتھوں میں اٹھا کر دوڑتے ہوئے سڑک پر آ گے۔ گلستان کے خوشبودار خون کی مہک فضا میں پھیلنے لگی۔ لوگوں نے گلستان کو زخمی حالت میں اسپتال پہنچا دیا۔ ڈاکٹر رات بھر اُس کو بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اُس کی ماں رُو رُو کر اُس کے سر کو سہلاتی رہی۔ کالی رات کے آخری حصّے میں گھنٹی کی خوفناک آواز سے اُس کا دل بیٹھنے لگا اور اُس نے آخری مرتبہ ماں کی گود میں سر رکھ کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا:

"ماں...... مجھے میرا زخمی دوست علاج کے لئے بُلا رہا ہے......اُس کے جسم سے خون بہہ رہا ہے...... ماں...... مایوس مت ہونا......اندھیرا بھاگ رہا ہے......اور ......اور اُجالا آ رہا ہے......"

ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ پرندے پیڑوں پر خاموش ہو گئے اور اُس کی ماں کی قوتِ گویائی......! ؎

؎ یہ کس نے قتل کیا شہرِ خوش کلام میرا
میں جس سے بات کروں وہ بے زباں نکلتا ہے
(وزیر آغا)



احتسابی جزیرہ

ایک دل فریب جزیرہ...... جہاں، نہ کسی تہذیب کی پرچھائی تھی اور نہ کسی مخلوق کا سایہ تھا۔ رنگارنگ پھولوں اور قسم وار پھلوں سے سجا ہوا یہ خوبصورت وادی نما جزیرہ' بحرِ بےکراں کے قلب میں واقع تھا، مصنوعی روشنی کی زہریلی کرنوں سے آزاد...... پُر سکون فضاؤں کا یہ مسکن...... صدیوں بعد دریافت ہوا تھا۔ شعور جب فکری طور پر غیر فطری سوچ کے دھوکے سے آگہی حاصل کرتا ہے تو وہ بصارت کے علاوہ بصیرت کا متلاشی بن جاتا ہے تاکہ اُس کی خام فکر، پختگی کے اکیسر کے ساتھ ساتھ روحانی سکون سے بھی لطف اندوز ہو سکے۔ دو تہذیبوں کی پروردہ نسلیں، خاموش پرندوں کی صورت میں جزیرہ کے سبزے پر الگ الگ قطاروں میں کھڑی تھیں۔ ایک تہذیب کی نسل میں عمر رسیدہ مخلوق کا سہارا ان کے لمبے لمبے سایہ دار شجر تھے اور دوسری تہذیب کی عمر رسیدہ نسل خاردار جھاڑیوں سے مجروح ہو رہی تھی۔ دو پہاڑیوں کے اوپر دو درخت نظر آرہے تھے ایک درخت کے اوپر سبز رنگ کا ایک کپڑا لہرا رہا تھا جس پر مشرقیت لکھا ہوا تھا اور دوسرے درخت کے سرخ کپڑے پر مغربیت لکھا ہوا تھا۔ دونوں درختوں نے اپنی اپنی

جڑوں سے اپنی اپنی تاریخ کو باہر نکالا۔ پہلے والے درخت کی تاریخ پر ''روحانیت'' کا لفظ کا لکھا ہوا تھا اور دوسرے درخت کی تاریخ کے اوپر ''مادیت'' کا لفظ لکھا ہوا تھا۔

صدیوں سے غور وفکر کرنے کے بعد وقت نے ان دو تہذیبوں کے لئے یہ احتسابی جزیرہ دریافت کیا تھا کیونکہ یہ جزیرہ فطرت پسند تھا۔ مصنوعیت پرستی کی منطق صنعت گری کے لئے یہاں پر کوئی گنجائش نہیں تھی اور نہ ہی یہاں پر جمودی فکر کی کوئی منطق کام آسکتی تھی۔ یہاں پر صرف فطرت کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ دونوں تہذیبیں اپنی اپنی پروردہ نسل کے نشیب وفراز کے احتسابی نتائج سننے کے لئے بے چین ہو رہی تھیں۔

پہاڑیوں کے درمیان موجود ایک اونچے پہاڑ کے اوپر سبز پروں والا ایک بڑا پرندہ نمودار ہوا۔ اُس کے حلق میں ایک بڑا ترازو لٹک رہا تھا، اُس نے اپنی خوبصورت لمبی چونچ سے دونوں تہذیبوں کی تواریخ کو ایک ایک کر کے اٹھایا اور ترازو کے پلڑوں میں رکھا۔ اُس نے دونوں تہذیبوں کے پرندوں کو پہاڑیوں پر موجود درختوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں تہذیبوں کے پرندے اپنے اپنے علامتی پیڑ پر آبیٹھے۔ اُس نے اپنی لمبی چونچ سے دونوں تہذیبوں کی تواریخ کو ادوار کے حساب سے درختوں کی جڑوں پر پھینکنا شروع کر دیا۔ ابتدائی ادوار کو پھینکتے ہوئے اُس نے اعلان کر دیا کہ ہر دور کی سرد وگرم ہواؤں کے ساتھ تم داخلی اور خارجی نشیب وفراز کے احتسابی عمل سے گزرو گے اور آخر پر اُسی پیڑ کے پرندے داخلی سکون محسوس کریں گے جو داخلی روحانیت اور خارجی مادیت کی کشمکش کے دوران توازن کی راہوں پر اعتدال کے ساتھ سفر کرتے آئے ہیں۔

ابتدائی ادوار کی تاریخ نے دونوں پیڑوں کی جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیا۔

دونوں پیڑ نشو ونما پا رہے تھے۔ پرندے بھی روحانی سایوں اور اخلاقی پھلوں سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ ہر پرندہ اطمینان کے ساتھ پرواز کرتا تھا اس لئے یہ ادوار دونوں پیڑوں کے پرندوں کو راحت افزا محسوس ہوئے۔

کچھ مدت کے بعد سبز رنگ کے پرندے نے تاریخ کے ادوار کا ایک اور حصہ پیڑوں کی طرف پھینکا۔ ان ادوار کی تاریخ جڑوں پر پڑتے ہی سرخ کپڑے والے پیڑ کے اردگرد کالے دھویں کے گولے اٹھنے لگے اور آن ہی آن میں اس پیڑ کے پرندوں کو کالے دھویں نے اپنی گود میں سُلا دیا۔ اس کے برعکس سبز کپڑے والے پیڑ کے اردگرد روشنی کے مینار کھڑے نظر آنے لگے۔ اس پیڑ کے پرندے تیزی کے ساتھ آزاد فضاؤں میں اڑنے لگے، وہ داخلی سطح پر بھی مطمئن نظر آتے تھے اور خارجی طور پر بھی پُرسکون دکھائی دیتے تھے۔ یہ لمبا دور سبز کپڑے والے درخت کے پرندوں کے لئے خوش نصیبی کا ضامن ثابت ہوا۔ فارغ البالی کے ان ادوار میں، ان خوشحال پرندوں نے اپنے زمین میں روحانیت کے بیج بوئے اور زمین کے اردگرد ضرورت کے مطابق مادیت کے پیڑ بھی اگائے۔ اس تہذیب کے رواں چشموں سے فیض بخش پانیوں کا ظہور ہوا جو کئی صدیوں تک نہ صرف ان پرندوں کو سیراب کرتا رہا بلکہ اندھیرے پیڑ کے چند پرندے بھی ان چشموں سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ وہ جب اس پیڑ کے خوشحال پرندوں کی داستان اندھیرے کے شکار اپنے ساتھیوں کو سناتے تھے تو وہ حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔ روحانیت کے پرستار پرندوں کی دریا دلی کا وہ اب ناجائز فائدہ اٹھانے لگے اور ان کے خلاف اندرونی طور پر سازشیں بھی رچانے لگے۔ کئی دفعہ دونوں کے درمیان ٹکراؤ بھی ہوئے لیکن روحانیت کے پرستار پرندے ہمیشہ غالب رہے۔

سبز رنگ کے پرندے نے اب تاریخ کے وہ ادوار پیڑوں کی طرف پھینکے جو

روحانیت اور مادیت کے درمیان کشمکش کے ادوار رہے تھے۔ تاریخ کے یہ ادوار سرخ کپڑے والے پیڑ کے پرندوں کے حق میں سودمند ثابت ہوئے اور سبز کپڑے والے پیڑ کے پرندوں کے لئے روحانی طور پر فائدہ منداور مادی طور پرناکام ثابت ہوئے، باالفاظ دیگر سبز کپڑے والے پیڑ کے اردگرد روشنی کم اور اندھیرا زیادہ دکھائی دینے لگا۔ تاریخ کے یہ دور صاف بتا رہے تھے کہ سبز کپڑے کے درخت پر بیٹھے ہوئے پرندے اب خواب غفلت میں پڑے ہوئے جمودی فکر کا شکار ہو چکے تھے، روحانیت کی غلط تعبیر کی وجہ سے ان کے طاقت ور پروں پر سستی اور بے ہمتی کے سائے پڑ گئے تھے اور دوسری جانب صدیوں تک اندھیرے میں رہنے والے پرندوں کی دنیا روشن ہوتی جارہی تھی۔ وہ بڑی چالاکی اور مستعدی کے ساتھ ان چشموں کو پانے میں لگ گئے جو خوشحال پرندوں کی میراث تھے۔ کئی صدیوں کی جدوجہد کے بعد جب مادیت پرست پرندے سفید وسیاہ کے مالک بن گئے تو روحانیت پسند پرندوں کی آنکھیں کھلنے لگیں لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ مادیت پرستی کے جنون میں سرخ کپڑے والے پیڑ کے پرندوں نے زندگی گزارنے کے لئے مصنوعی اصول اور قوانین بنا ڈالے جو فطری اصولوں اور قوانین سے متصادم ہو رہے تھے۔ جس کے نتیجے میں وہ فکری انتشار کی لپیٹ میں آگئے۔ داخلی بے چینی اور خارجی بے قراری کی وجہ سے ان کی سوچ پر پاگل پن کے اثرات طاری ہونے لگے۔ اپنی قوت کا غیر فطری استعمال کرنے کے باعث انھوں نے اُسوقت اپنے آپ کو وحشی جانور کے طور پر پیش کیا جب ان کے آگ برساتے گولوں سے زمین کا ایک خوبصورت حصہ جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا اور اس خطے کے سینکڑوں پرندے دھکتے شعلوں کی نظر ہو گئے۔ زندگی کے ہر موڑ پر فطری قوانین سے بغاوت کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کی نئی نسل، جنہیں وہ پھول سمجھ بیٹھے

تھے۔ خار بن کران کی روح کو چبکنے لگے اوران کے مصنوعی تصورات کیڑے بن کران کے جسم کو اندر سے کورنے لگے اوراب یہ مصنوعی سوچ کی اسیر نسل داخلی سکون کی تلاش میں سرگرداں نظر آرہی تھی۔

سبز رنگ کے پرندے نے تمام ادوار کی تاریخ کو واپس اٹھا کر اپنے اپنے پلڑے میں ڈال دیا۔ مادیت کا پلڑا ہلکا ہوا جا رہا تھا اور روحانیت کا پلڑا بھاری پڑ رہا تھا۔ مادی تہذیب کے پیڑ کی جڑیں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں اور وہ اندر ہی اندر کھوکھلا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے برعکس روحانیت کے پیڑ کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ اپنی زمین سے پیوستہ تھیں۔ اس کی چند ہی جڑیں کمزور پڑ گئی تھیں۔ سبز رنگ کے پرندے نے اعلان فرمایا کہ دونون تہذیبیں احتسابی عمل سے گزر چکی ہیں اسلئے انھیں احتسابی جزیرہ چھوڑنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

تمام پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹنے لگے۔ روحانیت پرست پرندے اطمینان کے ساتھ محو پرواز تھے لیکن مادیت پسند پرندوں کو اپنے بنائے ہوئے کانچ کے گھونسلے ٹوٹتے بکھرتے نظر آرہے تھے۔ وہ اپنی شناخت کو بچانے کے لئے حواس باختہ ہو رہے تھے۔ دوران پرواز وہ روحانیت پرست پرندوں پر گاہے گاہے حملہ بھی کرتے رہتے تھے اور روحانیت پرست پرندے بھی اپنے دفاع کے لئے جوابی حملوں کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سبز رنگ کے پرندے نے اونچی اڑان بھری تھی وہ دور سے دیکھ رہا تھا کہ فضائے بسیط میں ہر طرف رَن مہتاب کے شعلے برس رہے ہیں اور وقت محسوس کر رہا تھا کہ تاریخ کا یہ دور ان دو تہذیبوں کا آخری احتسابی دور ہے اور روحانیت اور مادیت کے مابین آخری کشمکش...... آخری کشمکش......!!!



گمشدہ سرمایہ

وہ تیسری بار سرکاری اسپتال میں ایڈمٹ ہوا تھا۔ میڈیکل رپورٹ پڑھتے ہوئے اُس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ رپورٹ فائل کو بند کرتے وہ سوچنے لگا کہ آج وہ زندگی کے اس پُرکھٹن موڑ پر تنہا کھڑا ہے جہاں پر اُسے سہارے کی ضرورت ہے۔ اپنوں کے سہارے کی، جن کا کیریئر بنانے کے لئے اُس نے اپنا سب کچھ وقت کے داو پر لگا یا تھا۔ بڑھاپے کے بھیانک خوف اور ہارٹ پرابلم کے خوفناک ڈر نے اُس کے دماغ کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اُس کی سوچ جب دماغ کے دو حصّوں کو جوڑنا چاہتی تو وہاں انتشار کا آتش فشاں پھٹ جاتا اور وہ مایوسی کے عالم میں خود کو پر شکستہ پرندہ تصّور کرتا تھا۔

اس کا کُنبہ بارہ نفوس پر مشتمل تھا جس میں اُس کے علاوہ اُس کے چار لڑکے، اُن کی بیویاں اور بچے شامل تھے۔ چاروں لڑکے دوسرے ملکوں میں جاب کرتے تھے، ان کو اعلیٰ تعلیم دلانے میں اُس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ خود تو وہ ایک پینشن یافتہ پوسٹ مین تھا لیکن اپنے بچوں کے کیریئر کو سنوارنے میں اُس نے اپنا تمام سرمایہ لٹا ڈالا

تھا۔ وہ خود غرض قسم کا انسان نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ سمجھتا رہا کہ انسان کی زندگی ایک لمبی دوڑ کی طرح ہے جس میں والدین، بھائی بہنوں اور اپنی اولاد کے لئے پڑاؤ آتے ہیں اور انسان کو دوڑنے کے دوران تمام منزلوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس طرح سے زندگی کا یہ لمبا سفر بہتی ندی کی طرح آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اُس کے والدین جب تک حیات تھے وہ ہمیشہ ان کی نگاہوں میں ایک فرمانبردار بیٹا رہا اور ان سے دعائے خیر پاتا رہا۔ لیکن آج وہ خود زندگی کے اُس پڑاؤ پر پہنچا تھا جہاں اُسے اپنے بچوں کے سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن...... اُس کے بیٹے اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل بنانے میں ایسے کھو گئے کہ ان کے ذہن سے شاید "ماں باپ" جیسے عظیم لفظوں کا تصور تک "گمشدہ شئے" کی طرح محو ہوئے تھے۔ وہ برسوں پہلے بدیش چلے گئے تھے، جہاں پر اُس کا ایک لڑکا نامور ہارٹ سرجن تھا اور دوسرے لڑکوں کا بھی اچھا خاصا بزنس تھا۔ وہ جب بھی ان کی لاپروائی کے بارے میں سوچتا تھا تو خود کو کوستا رہتا کہ شاید اُسی کی تربیت میں کچھ کھوٹ رہی ہوگی۔

اسپتال میں اُسے پڑے ہوئے کئی ہفتے گزر گئے۔ روز بروز اس کی بگڑتی صحت کو دیکھتے ہوئے ایک دن ڈاکٹروں نے اُسے کہا کہ اُسے دل کا آپریشن کرنا پڑے گا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ آپریشن امریکہ میں مقیم مشہور ہارٹ سرجن ڈاکٹر ارشد خان ہی کر سکتا ہے، جس کے لئے اُسے ایک لاکھ روپے بطور فیس ادا کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر ارشد کا نام سنتے ہی غفار خان کا چہرہ خوشی سے کھِل اٹھا، وہ فخریہ انداز سے خود کو دنیا کا سب سے بڑا خوش نصیب باپ سمجھنے لگا۔ اُسے وہ وقت یاد آیا جب ارشد کو امریکہ روانہ کرنے کے لئے اُس نے اپنے جی۔ پی فنڈ سے پچاس ہزار روپے نکالے تھے اور پیسہ نکالتے وقت جب اپنے آفیسر نے اُسے پوچھا تھا کہ "غفار خان اگلے برس تم ریٹائر ہو رہے

ہو، اپنے لئے کیا رکھو گے؟'' تو غفار خان نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

''جناب! میری زندگی کا اصلی سرمایہ میرے بچے ہیں۔ اگر میں اپنے پیسوں سے اپنے بچوں کو خوشیاں نہ دے سکوں تو یہ پیسے میرے کس کام کے......؟''

چند دنوں کے اندر غفار خان نے امریکہ میں مقیم اپنے لخت جگر ڈاکٹر ارشد خان سے فون پر رابطہ کیا اور اپنے آپریشن کے بارے میں بتایا۔ ارشد خان نے اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کا بہانہ بنا کر یہ کہتے ہوئے اپنا دامن چھڑا لیا کہ ''وہ آپریشن کے سلسلے میں ڈاکٹروں کو فون پر ہی ضروری معلومات فراہم کرے گا۔'' اپنے مشہور ڈاکٹر بیٹے کا یہ مشورہ سُن کر غفار خان ٹھنڈا پڑا گیا، وہ ٹوٹے قدموں سے اسپتال کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

ایک دن غفار خان کا چیک اپ کرتے ہوئے ڈاکٹروں نے اُسے بتایا کہ خوش قسمتی سے ڈاکٹر ارشد ایک آپریشن کے سلسلے میں آج امریکہ سے یہاں آرہے ہیں کیونکہ کل اُسے ایک منسٹر کے لڑکے کا آپریشن کرنا ہے جس کے لئے ڈاکٹر ارشد کو ایڈوانس میں دو لاکھ روپے بیجدئے گئے ہیں۔'' ڈاکٹروں نے غفار خان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا کہ ''اگر تم پیسوں کا انتظام کرسکو گے تو تمہارا آپریشن بھی کل ہو جائے گا۔''

یہ سنتے ہی غفار خان کا چہرہ زرد پڑ گیا؟ وہ کچھ کہہ نہ سکا وُہ سوچ رہا تھا کہ اُس کے پاس دوا خریدنے کے لئے ایک کوڑی بھی نہیں ہے یہاں تو ایک لاکھ کا مسئلہ ہے۔ غفار خان کا دوست رجب علی اسوقت وہاں پر موجود تھا۔ اُس نے غفار خان کی بے چین حالت دیکھ کر کہا کہ ''میرے دوست تم فکر مت کرو۔ تمہارے آپریشن کے لئے میں اپنے سخاوت سنٹر سے پیسوں کا انتظام کرونگا۔ تم ضرور ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' غفار خان کو دلاسہ دے کر رجب علی ڈاکٹر ارشد کا انتظار کرنے لگا۔ چند گھنٹوں کے بعد جب

رجب علی کو ڈاکٹر ارشد کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ سیدھے گسیٹ ہاوس میں اُسے ملنے کے لئے چلا گیا۔ ڈاکٹر ارشد سے آپریشن کے سلسلے میں ٹائم مقرر کرنے کے بعد رجب علی واپس لوٹ کر غفار خان کے بیڈ پر بیٹھ گیا اور پُر مسرت لہجے میں اُسے کہنے لگا:

''ڈاکٹر ارشد کے ساتھ تمہارے آپریشن کے بارے میں بات ہوئی۔ اُس نے فیس میں سے بھی پچاس ہزار روپے معاف کردے۔ کل صبح سویرے وہ تمہارا آپریشن کرے گا۔''

یہ کہہ کر رجب علی نے جب غفار خان سے گھر جانے کی رخصت لے لی تو غفار خان کو محسوس ہونے لگا کہ ''اُس کا نور چشم آپریشن کرنے کے لئے رضامند نہیں ہوا ہے بلکہ پیسوں کی لالچ میں اپنے باپ کے دل کو کُند چھری سے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے تیار ہوا ہے۔'' یہ سوچتے سوچتے غفار خان کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی جو دھیمی دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی کہ ''آج ایک بیٹے نے اولاد کے فرض اور باپ کے حق کو سرعام نیلام کردیا۔''

غفار خان رات بھر افسوس کرتا رہا کہ اُس نے ایک انسان کو گھر سے باہر بھیجا تھا وہ وہاں جا کر کیسے حیوان بن گیا۔ صبح ہونے سے پہلے غفار خان یہ کہتے کہتے بیڈ پر لیٹ گیا کہ ''نافرمان اولاد گمشدہ شے کے مانند ہوتی ہے۔'' سویرے جب اسپتال کے ملازم غفار خان کو آپریشن تھیٹر میں لے جانے کے لئے وارڈ میں داخل ہوئے تو وہ غفار خان کے ٹھنڈے جسم کو دیکھ کر مایوس ہو کر واپس لوٹے، کیونکہ غفار خان نے زندگی کی اُداس دوڑ سے سحر ہوتے ہی چھٹکارا حاصل کیا تھا اور اُس کی کھلی آنکھیں کسی گمشدہ سرمایہ کے تلاش کی طرف اشارہ کررہی تھیں۔



سفید ہاتھی

آسیب...... گہری نیند کا آسیب......ان کی سوچ پر چھایا ہوا تھا۔وہ......ان کی بے خودی دیکھ کر بے چین ہو جاتا تھا اور ان بے حس سوچ رکھنے والوں کے بند پڑے دماغوں کے دریچوں کو کھولنے کی کوشش میں لگا رہتا لیکن بار بار کوشش کرنے کے باوجود اُسے کبھی کبھی محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے دماغ زنگ آلودہ سوچوں کے جمودی کھنڈرات بن چکے ہیں۔ وہ جب ان کے اندھیرے دنیا کی چھتوں پر بیداری کی روشن قندیلیں لٹکائے رکھتا اور ان کے گونگے پن کو آواز میں بدلنا چاہتا تو وہ ان کی آنکھوں میں بصیرت کے چراغوں کو ٹمٹماتے ہوئے پاتا اور ان کی زبانوں کو اندرونی گروہ بندی کے بکھیڑوں میں الجھنے کی وجہ سے ہکلے پن کا شکار پاتا۔ان کے فرسودہ خیالات پر اُسے ترس آرہا تھا......طوفان کے گھپ اندھیرے میں خیالی ابابیلوں کا انتظار......خوش فہمی ......صرف خوش فہمی کا دھوکہ،اور خوش فہمی کا نتیجہ......مقدر کا سراب......وہ سوچتا رہتا کہ خواب غفلت میں مست یہ مخلوق......سورج سنسار میں ہو رہی دھماکہ خیز تبدیلیوں سے

بے پروا...... اپنی اپنی پنجر نما بلوں کو گوشۂ عافیت سمجھنے کے فریب میں ڈوبتی چلی جا رہی ہے۔ ان کند ذہنوں کا عالم، ابھرتے ڈوبتے سورج کی گردش تک محدود ہو کے رہ گیا ہے۔ کارگاہ ہستی کے گھمسان رن میں ان کے ٹوٹے قدموں کی اپاہج آہٹ بھانپ کر اور ان کے کھوکھلے لفظوں کی جھنکار سن کر...... اُس کا وجود لرز اٹھتا تھا۔ وہ چلاتا رہتا کہ کھوکھلے لفظوں کی تکرار، بونوں اور بے ہمتوں کی نشانی ہوتی ہے۔ ان کی بے حسی کو کوستے ہوئے وہ انھیں ایسی جمادات نما مخلوق قرار دیتا تھا جو صرف ادھار سانسوں کا حساب رکھنا جانتی ہوں۔ وہ ان کے خوابیدہ ذہنوں میں انقلاب برپا کرنا چاہتا تھا لیکن ان کی سرد مہری دیکھ کر اسے یقین ہو جاتا تھا کہ یہ مخلوق تو رزم گاہ حیات میں کودنے سے خوف کھا رہی ہے اور صرف توکل کے نام پر حیات مستعار پر ہی قانع کے متمنی ہے۔

سفید ہاتھی آندھی کی طرح ان کے گلستانوں کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان کے کھیت کھلیانوں کو تباہ کرتے جا رہے تھے۔ وہ اپنی لمبی لمبی سونڈوں کی بدبودار سانسوں سے ان کے خوشبودار چمن زاروں کو زہر آلود کرتے جا رہے تھے اور اپنے پتھر جیسے بھاری پاؤں سے ان چمن زاروں کے رنگ برنگے پھولوں کو مسل رہے تھے۔

سفید ہاتھیوں کا یہ وحشی قافلہ عرصہ ہائے دراز سے ان پر حملہ آور ہوا تھا یہ درندہ صفت قافلہ اس جمادات نما مخلوق کو صف ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ، بڑے غور سے سفید ہاتھیوں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران پڑ جاتا تھا کہ ان حملہ آور ہاتھیوں کے پیچھے قُقنُس کا مسحور کن ساز بج رہا ہے اور اس ساز کی بدلتی رہتی آوازیں ان ہاتھیوں کی وحشیانہ سوچ پر اثر انداز ہو رہی ہیں...... ان کے وحشیانہ جذبات کو بھڑکا رہی ہیں اور ان کو اپنے مقصد کو پورا کرنے تک متحد رہنے کی صدائیں دے رہی ہیں۔

ساز کی دلفریب دُھنیں سفید ہاتھیوں کے جوش کو اُبال دینے میں مگن تھیں۔

سونڈوں سے شعلے برس رہے تھے جن کی لپٹوں سے مظلوم مخلوق کی تاریخی پناہ گاہیں، آگ کی خندقیں بن رہی تھیں اور تباہی مچانے کے بعد وہ بدمست ہاتھی محکوم مخلوق کے کنوؤں سے آب حیات پیتے ہوئے راحت محسوس کرر ہے تھے۔

وہ......ان سفید ہاتھیوں کے عزائم، ان کی ہمت اور مادی مقاصد کے رازوں کو جاننے کے لئے بے چین ہورہا تھا۔ وہ یہ جان کر سخت حیران ہوا کہ نہ صرف ققنس کے راگ سفید ہاتھیوں کی رہنمائی کرر ہے ہیں بلکہ پردے کے پیچھے چھپے کالے ناگ بھی پھن مارتے ہوئے انھیں آگے بڑھنے کے لئے اُکسار۔ہے ہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ کالے ناگ تو اپنی فطرت پر برابر قائم ہیں یہ تو آستین کے سانپ ہی نکلے۔ مکاری اور دغابازی کے جراثیم تو ان کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرر ہے ہیں......احسان فراموش......!!

اس کے سامنے کالے ناگوں کا وہ دور آیا جب ان کی دھرتی بنجر نما جنگل تھا...... وہاں تہذیب وتمدن کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا......اس نیم مردہ مخلوق نے ہی ان کے چمن کو تہذیب وتمدن کا گہوارا بنایا تھا اور ان کی دھرتی ہیرے موتی اُگلنے لگی تھی اور ان ہیرے موتیوں کی چمک دمک سے ان سفید ہاتھیوں کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں اور انھوں نے ان کے چمن کو تاراج کرڈالا تھا۔ اسوقت ان بزدل کالے ناگوں کی ہمت اسی مظلوم مخلوق نے بڑائی تھی جن کے خلاف آج یہ سفید ہاتھیوں کے ساتھ مل کر در پردہ سازشیں رچار ہے ہیں۔ اگر یہ کالے ناگ اپنی دھرتی سے آج بھی پوچھیں گے کہ تجھے آزادی کیسے نصیب ہوئی تو اُس دھرتی کی سچی تاریخ اس محکوم مخلوق کے کارناموں کو ضرور دھورائے گی......بنجر زمین کے یہ کالے ناگ سب احسان بھول بیٹھے......!!!

اس اندوہناک صورت حال کا مشاہدہ کرکے وہ دوبارہ بے حس مخلوق کو بیدار

کرنے لگا ان کو تمام حقیقتوں سے باخبر کرنے لگا۔ وہ انھیں، ان کے دورِ اقتدار کی داستانیں سناتا رہا اور انھیں چلا چلا کر پکارتا رہا کہ اٹھو! ان وحشی درندوں کو ماضی کی طرح سبق سکھاؤ۔ اپنی بہادری اور جواں مردی کے جوہر دکھاؤ...... تمہارے چمن کے چند بہادر شاہین پہلے ہی ان وحشیوں پر جھپٹ پڑے ہیں...... ہوش میں آجاؤ، تم کمزور نہیں ہو...... تم میں صرف اتحاد کا فقدان ہے۔ متحد ہو کر ان بزدلوں پر ٹوٹ پڑو...... اندھیرا مٹنے والا ہے اور اُجالا تمہارا انتظار کر رہا ہے...... اٹھو! اپنے گلستانوں کو بچاؤ...... اپنے نخلستان کو بچاؤ...... یہ کہتے ہوئے وہ آسمان کی طرف آبدیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اُس کے اندر سے سرد آہیں نکل رہی تھیں۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی سرد آہوں سے افلاک کے پردے چاک ہو رہے ہیں۔ بارانِ رحمت کا نزول ہو رہا ہے اور چمن کے پھولوں کا نکھار بڑھ رہا ہے۔ اُسے نظر آنے لگا کہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے نیم مردہ مخلوق کی بند پڑی آنکھیں آہستہ آہستہ کھل رہی ہیں اور بھینی بھینی خوشبوؤں سے ان کے دماغوں نے سوچنا شروع کر دیا اور ان کے جسم سفید ہاتھیوں کے شعلوں کی تپش محسوس کرتے ہوئے حرکت کرنے لگے۔

دھوپ نکلنے کے ساتھ ہی...... وہ...... دور دور تک چیونٹیوں کی لمبی لمبی قطاروں کو پھیلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ سفید ہاتھیوں کی بدصورت سونڈیں کنوؤں سے آبِ حیات چُرانے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ چیونٹیوں نے مخصوص حکمتِ عملی کے تحت آہستہ آہستہ ان سونڈوں میں گھسنا شروع کر دیا اور ان کے دماغوں کو نوچ کر ان کے جسموں کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرنے لگے۔ سفید ہاتھی اندرونی زلزلے سے تھرتھرا کر دھڑا دھڑ زمین پر گرنے لگے اور سازشی ققنس کا گلہ شاہینوں کے ڈر سے بیٹھنے لگا اور وہ کرگسوں کی طرح چمن سے بھاگنے لگے۔ کالے ناگ اپنے حلیفوں کی یہ شکست خوردہ اور وحشت ناک صورتحال

دیکھ کر بزدلوں کی طرح مکاری کے بلوں میں چُھپ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نیم مردہ مخلوق نے ایک طاقت ورقابلے کی صورت اختیار کرلی۔ چمن دوبارہ خوشبودار ہواؤں سے مہک رہا تھا اور ......وہ ......خوشی سے جھوم رہا تھا کہ اس کی صدائیں محکوم مخلوق کو جگانے میں بانگ درا ثابت ہوئیں ......وہ ......انھیں شاباشی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ وہ مردہ بن گیا تھا لیکن اب وہ زندہ ہے......زندہ......!



ناکہ بندی

چار مہینے کا ننھا سا پھول دودھ کی ایک ایک بوند کے لئے ترس رہا تھا اُس کی دلخراش چیخیں ماں باپ کے جگر کو پارہ پارہ کررہی تھیں۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے ان کے کلیجے کو تیز تلوار سے کاٹا جارہا ہے۔ بھوکے بچے کی ابتر حالت اور اپنی بے بسی و بے کسی کا رونا روتے روتے ساجدہ اور بشیر ملک کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں بنجر زمین کے بنجر ذہن آدھی باسیوں نے سرسبز اور شاداب وادی کے بے مثل مہمان نواز انسانوں کا دانہ پانی بند کردیا تھا۔ کئی مہینوں سے چل رہی اقتصادی ناکہ بندی کے ٹوٹنے کے تمام راستے بلوائیوں کے محسن جمہوریت پسند سیاستدانوں کی شاطرانہ مصلحت آمیزی اور جانبدارانہ پالیسوں کے بھنور میں پھنسے ہوئے تھے اور وادی کے طول و عرض میں قحط نما صورت حال تھی۔

"بشیر! منا بے ہوش ہوگیا ہے" ساجدہ نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "کہیں سے آٹو کا انتظام کرو اس کو اسپتال لے جاینگے۔"

"اس اندھیری وحشت ناک رات میں ہم کس طرح گھر سے نکلیں گے۔" بشیر

ملک نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا'' باہر کرفیو لگا ہوا۔ ہے۔ صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر...... صبح کو بھی کون اسپتال جانے دیگا۔''

لیکن بشیر...... صبح......؟ ساجدہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔

''ساجدہ! کسی پڑوسی سے منا کے لئے دودھ ادھار مانگ لو''بشیر ملک نے کہا۔

ساجدہ غم ناک آواز میں بولی'' وہ لوگ مجھ سے،ی دودھ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ان کے بچے بھی بھوک سے بلک رہے ہیں۔''

کچھ دیر کے بعد فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بشیر ملک نے ریسور اٹھایا۔ جموں سے اُس کا چھوٹا بھائی عرفان ایک ہی سانس میں بول پڑا'' بھائی جان ! اندھیرے کا سہارا لے کر میں ٹرک لے کر جموں سے گزر رہا ہوں۔ فکر مت کرنا! میں نے منے کے لئے دودھ کی ایک پیٹی بھی لائی ہے،،بشیر ملک نے یہ بات جب ساجدہ کو بتائی تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

بشیر ملک نے کرسی پر بیٹھ کر تھوڑی سی راحت محسوس کی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا اور گزرے دنوں کی خوشنما یادوں میں کھو گیا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ کس طرح ہم کشمیری اپنی جنت میں وارد مہمانوں کا استقبال بے مثل فراخ دلی سے کرتے تھے اور اپنی مہمان نوازی کے حسین نقوش ان کے دلوں پر چھوڑ کر بار بار یہ ثابت کرتے آئے تھے کہ'' ذرا ذرا ہے میرے کشمیر کا مہمان نواز۔''اُس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں لیکن وہ اب کچھ اور ہی محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس انسانی سلوک کے بدلے یہ لوگ حیوانیت پر اتر آئے ہیں، ان لوگوں نے اپنے زہر آلودہ منصوبوں سے وادی کے خوش نما اور خوبصورت پھولوں کو مسلنے کی قسم کھائی ہیں۔ ان کی خمیر میں ہی شاید منافرت کا زہر ملا ہوا ہے، نہیں تو یہ لوگ کیسے بھول جاتے کہ جب یہ لوگ کشمیر میں اپنے مذہبی مقامات

پر زیارت کے لئے آتے تھے تو ہم لوگ جگہ جگہ ان کے لئے کھا۔نے پینے کا اعلیٰ انتظام رکھتے تھے اور ماضی میں کئی بار جب موسم کی خرابی کی وجہ سے یہ لوگ مصیبت میں پھنس گئے تھے تو ہمارے گھر ان کے لئے بہترین اور پر امن پناہ گاہ ثابت ہو۔تے تھے اور آج یہی لوگ زمین کے وارثوں کو ہی کاشت کار بنانا چاہتے ہیں اور مکان کے مکینوں کو کرایہ دار......!

یہ لوگ پریشانیوں کی وجہ سے کئی راتوں سے سو نہیں پائے تھے۔رات کے آخری حصے میں جب بشیر ملک کی آنکھ لگ گئی تو صبح سویرے انھیں فون پر کسی دوست نے اطلاع دی کہ آج کسی رضا کار تنظیم کی طرف سے انسانی حقوق کے دفتر کے سامنے مِلک فوڈ بانٹا جائے گا۔بشیر ملک یہ سُن کر گھر سے تیزی کے ساتھ نکلا اور شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے وہاں پہنچ گیا اور بڑی مشکل سے دودھ کا ایک ڈبہ حاصل کر پایا۔ادھر ساجدہ اپنے بے ہوش لختِ جگر کو لے کر اسپتال کی جانب دوڑ پڑی۔وہ جب پریشان حالت میں سنسان سڑک کو پار کر رہی تھی کہ اچانک کہیں سے آواز آئی ”کرفیوں میں کہاں جا رہی ہو:؟“

ساجدہ نے خوف کے مارے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

”بچہ بیمار......اسپتال......!“ یہ سنتے ہی کئی وردی پوش سڑک پر نمودار ہو گے۔

ساجدہ دہشت زدہ ہوئی، اُس نے بچے کو چھاتی سے لگایا۔

”اچھا! بیمار بچے کو اسپتال لے جانا ہے“ ایک وردی پوش بولا ”اسپتال جا کر کیا کروگی وہاں تو دوائی نہیں ہے۔“

چند لمحوں بعد کہیں سے ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور بچے کے پھول جیسے نازک بدن کو چیرتی ہوئی ماں کے دل میں پیوست ہوگی۔چاروں طرف ہنسنے کی آوازیں آئیں

اور خون میں لت پت دونوں لاشیں گھر کے صحن میں پھینک دی گئیں۔

بشیر ملک شہر کی گنجان آبادی سے چوری چھپے خوش ہو کر دودھ کا ڈبہ بغل میں چھپاتے ہوئے جب گھر کے مین گیٹ پر پہنچا۔ تو صحن میں داخل ہوتے ہی اُس کی نظر بیوی اور بچے کی لاش پر پڑی۔ وہ حواس باختہ ہو کر چیخنے چلانے لگا۔ اس کی چیخیں صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی تھیں کیونکہ وردی پوشوں کے خوف کی وجہ سے تمام لوگ گھروں کے اندر سہم گئے تھے۔

عرفان جب رات کے اندھیرے میں چاول سے بھرا ٹرک کشمیر کی طرف لے کر آ رہا تھا تو بیچ سڑک پر اُسے بلوائیوں نے روکا۔ وہ لوگ ہاتھوں میں ترشول اور سر پر کیسری رنگ کے کپڑے باندھے نعرہ لگا رہے تھے۔

"ہر ہر مہادیو۔ وندے ماترم...... بلوائیوں نے ٹرک پر حملہ کر کے سارا چاول لوٹ لیا اور عرفان کو ٹرک کے ساتھ زندہ جلا ڈالا۔ بشیر ملک اس اندوہ ناک صورت حال سے بے خبر تھا۔ اُس نے عرفان پر موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اسے گھر کے سانحہ کے بارے میں بتائے لیکن عرفان کا موبائل بند آ رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد عرفان کے ایک ساتھی ڈرائیور کا فون آیا اُس نے بشیر ملک کو عرفان کے حادثے کے بارے میں بتایا۔ یہ خبر سنتے ہی بشیر ملک کے اوپر جیسے دوہرا آسمان ٹوٹ پڑا۔ اُس کی آواز بند ہوگی۔

کرفیو میں آدھے گھنٹے کی ڈھیل دی گی۔ بشیر ملک گھر سے باہر نکلا اور بازار کی طرف چل پڑا۔ اُس کے ہاتھ میں دودھ کا ڈبہ تھا۔ کچھ لوگ سڑک پر جمع ہوگے۔ بشیر ملک کے ہاتھ میں مِلک فوڈ دیکھ کر ایک آدمی سامنے آیا اور بشیر ملک سے پوچھنے لگا۔

"اے بھائی! تمہیں یہ دودھ کا ڈبہ کہاں سے ملا؟ کیا اسے بیچو گے؟"

بشیر ملک نے جب ہاں میں جواب دیا تو وہ آدمی حیران ہو کر بول پڑا۔
"لیکن کیوں! تمہیں بھی تو اپنے بچے کے لئے اس کی ضرورت ہوگی۔"
"میرے بچے کو اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ کفن کے انتظار میں ہے۔ جس کے لئے مجھے پیسے چاہئیں۔" یہ کہتے ہوئے بشیر ملک کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار اُمنڈ پڑی۔

اسی دوران لوگوں نے ناکہ بندی اور کرفیو کے خلاف پرامن احتجاج شروع کیا۔ مظاہرین کو خاموش کرانے کے لئے وردی پوشوں نے ان پر گولیوں کی برسات برسائی۔ آدھے گھنٹے کی ڈھیل ختم ہوتے ہی دوسرے چند لوگوں کے ساتھ بشیر ملک کی لاش بھی گولیوں سے چھلنی سڑک پر کفن کا انتظار کر رہی تھی۔ اور قانون کی نظروں میں دھول جھونکنے کے لئے دودھ کے ڈبے کو بم بنا کر پیش کیا گیا......!



جشنِ قبرستان

بھیانک اندھیرے کے خوفناک سائے جب بستی کے چاروں طرف پھیل جاتے تھے تو انسان تو انسان..... بستی کے حیوان بھی خوف کے مارے سہم کر رہ جاتے۔ رات کے اندھیرے میں اٹھنے والی دہشت کی خوفناک آوازیں جب لوگوں کے دلوں پر اثر انداز ہو جاتیں تو پیر و جواں کی سوچوں پر وحشت کا سایہ چھا جاتا اور سوچ سمجھ کی قوت مفقود ہو جاتی۔ خوف و ہراس کا یہ لمبا سلسلہ بستی کی حقیقی تاریخ کا حصہ بن چکا تھا۔ اندھیرے کا یہ خوف جب رات کے وقت بستی کے مکینوں کی دھڑکنوں پر چھا جاتا تو وہ لوگ اندھیرے کمروں میں اپنے چھوٹے بچوں کو دھیمی آواز میں قصہ کہانیاں سنانا شروع کر دیتے تاکہ وہ اور ان کے بچے زندگی کے پریشان اوقات میں کچھ دیر کے لئے سکون کے لمحات بھر سکیں۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب دادا جی نے حقہ بھر دیا تو گھر کے تمام بچے اُس کے سامنے کہانی سننے کے لئے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک جب دادا جی نے ان کی طرف غور نہیں کیا تو پانچ چھ سال کا مہذب اُس کے شانے پر سوار ہو کر بول پڑا ”دادا جی! کہانی سناؤ نا......!“ دادا جی نے اُسے اپنے شانے سے اتار کر سامنے بیٹھا دیا۔ دادا جی نے زور سے حقے کا ایک کش لیا اور بے تاب بچوں سے پوچھنے لگا“

کہ کونسی کہانی، سننا پسند کرو گے؟"

"ہمیں جنوں اور پریوں کی کہانی نہیں سُننا ہے۔" دس برس کے قیصر نے کہا" ہمیں اس بھیانک اندھیرے میں دل دہلا دینے والی آوازوں کے بارے میں جاننا ہیں۔"

قیصر کی انوکھی بات سُن کر دادا جی کے ذہن میں جیسے ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کے سوچ کی کشتی کو قیصر نے طوفان کے ایسے بھنور میں پھینک دیا جہاں وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر نظر آتا ہے کہ اب اس کشتی کو خوفناک کہانی کے پتوار سے آگے کی طرف بڑھائے یا نہیں۔ دادا جی کے سوچ کی کشتی ابھی اسی بھنور میں ہچکولے کھا رہی تھی کہ شاہدہ نے دادا جی کی کشتی کو یہ کہتے ہوئے پتوار عطا کی کہ "ہاں دادا جی! ہمیں اندھیرے کی کہانی سناؤ نا؟" اب دادا جی کی ہمت بڑھ گئی اور اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ آج انھیں اس بھیانک اندھیرے کی کہانی ضرور سنائے گا کیونکہ زندگی کا کیا بھروسہ، کب اپنا سفر ختم کرے گی۔ یہ سوچتے ہوئے دادا جی نے کہانی شروع کی۔

وہ ایک پُرسکون وادی تھی۔ اُس کے چمنستان رنگ برنگے پھولوں سے مہکتے رہتے تھے۔ ان پھولوں کی خوشبودار ہوائیں جب فضا میں پھیل جاتی تھیں تو پہاڑوں کی دوسری جانب بسنے والے لوگوں کے دماغوں کو معطر کر دیتی تھیں۔ اس وادی کی ایک شاندار تواریخ تھی۔ اس کی اپنی ایک تہذیب، اپنا ایک تمدن تھا اور سب سے بڑھ کر جو دولت ان کے پاس تھی وہ تھا ان کا اپنا ایک آزاد ماحول۔ یہ ماحول، بھائی چارے، انسان دوستی اور انسانیت کی روشنی سے چمکتا رہتا تھا۔

"پھر کیا ہوا دادا جی" شاہدہ نے بیچ میں کہا۔

"تم آرام سے سُنو" دادا جی نے کھانستے ہوئے کہا۔

"انسان جب لالچی بن جاتا ہے تو اُس کے اندر انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔" اس خوشحالی کو لوٹنے کے ارادے سے لالچی انسانوں نے اس پر کبھی لشکر کشی کر کے اور کبھی مکاری اور چالبازی کا جال بچھانا شروع کر دیا۔ وادی کے لوگ کئی مرتبہ ان جابر اور لالچی انسانوں کو شکست دینے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن ان جابروں کی طاقت کے سامنے یہ کمزور انسان آخر کار ہار بیٹھے اور اس طرح وادی کے روشن دور پر بھیانک اندھیروں کے کالے سائے چھا جانے لگے۔ دادا جی نے یہ کہتے ہوئے یاسر کو حقے میں تمباکو ڈالنے کے لئے کہا۔ یاسر نے تمباکو ڈال کر اُسے سُلگاتے ہوئے کہا۔

"دادا جی! کہانی ختم ہو گی؟" "نہیں بیٹے" دادا جی نے کش لیتے ہوئے کہا "یہ کہانی کی ابتداء ہے" دادا جی نے جونہی دوسرا کش لیا تو باہر اندھیرے کی خوفناک آوازوں سے کان کے پردے پھٹنے لگے۔ تمام لوگوں سے کہا جا رہا تھا کہ وہ کل چھبیس جنوری کی صبح وادی کے قبرستان میں جمع ہو کر بادشاہ وقت کے ساتھ جشن قبرستان منائے گے تمام بچے یہ خوفناک آواز سُن کر سہم گئے اور دادا جی نے تمام بچوں کو یہ کہہ کر سونے کے لئے کہا کہ کل کہانی کا باقی حصہ قبرستان میں خود دیکھو گے۔

صبح سویرے، تمام لوگ قبرستان میں جمع ہوئے، دادا جی بھی بچوں سمیت وقت پر پہنچ گئے۔ تمام لوگوں کے زرد چہروں پر خوف و ہراس کی ہوائیاں دوڑ رہی تھیں۔ لوگوں کو سفید کپڑے پہننے کا حکم دیا گیا۔ ان کے ہاتھوں میں خون سے بھرے ہوئے گلاس تھما دئے گئے۔ بادشاہِ وقت آنکھوں پر دھوکے کی کالی عینک لگا کر ظلم کا جھنڈا لہرانے لگا۔ وہ جب لالچ کی کرسی پر بیٹھ گیا تو شاہی فرمان جاری ہوا کہ لوگ اپنے اپنے مسائل پیش کریں۔

یہ اعلان سنتے ہی ایک بوڑھے شخص نے قبرستان سے اپنے نوجوان بیٹے کی خون

آلودہ لاش نکالی اور اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا کر بادشاہ کے سامنے لائی۔ جونہی اس بوڑھے کے دل سے انصاف کی ایک سرد آہ نکلی تب ہی اُس پر شاہی کوڑوں کی بارش کی گئی۔ اُسے مجبور کیا گیا کہ وہ شاہی قانون پر عمل کرتے ہوئے اُس شاہی دربان کے گلے میں پھول کی مالا ڈالے، جس نے مشعل روشن کرنے کے جرم میں اُس کے نوجوان بیٹے کو مار ڈالا تھا۔ اُس مظلوم نے ایک ہاتھ سے اپنے بیٹے کی لاش کو تھامے رکھا اور کپکپاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنے بیٹے کے قاتل کے گلے میں مالا ڈال دی۔ ہر طرف ساز کی دھنیں بجنے لگیں اور بادشاہِ وقت نے دربان کو شاہی ایوارڈ سے نوازا۔

چند منٹوں کے بعد اُدھیڑ عمر کی ایک خاتون کو حاضر ہونے کا حکم ملا۔ سسکیاں لیتے ہوئے وہ خاتون جب اسٹیج پر چڑھ گئی تو اُس نے سر سے خون آلودہ کفن کا ایک گھٹا اتار کر بادشاہِ وقت کے سامنے رکھ دیا۔ بادشاہ نے اپنے منھ پر رومال رکھتے ہوئے اشارے سے اس خون آلودہ کفن کو ہٹانے کا حکم دے دیا۔ کفن ہٹاتے ہی اُس بے کس خاتون کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک ٹوکرا تھمایا گیا اور وہ آنسو بہاتے بہاتے ان درندوں پر مٹھائیاں ڈالنے پر مجبور کی گئی جنھوں نے اُس کی بیٹیوں کی پاک دامنی کو داغ دار کر کے انھیں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

آخر پر بادشاہِ وقت کے سامنے ان معصوم بچوں کو ٹولیوں کی صورت میں لایا گیا جن کے والدین اندھیرے کو مٹانے کی کوشش میں مشعل روشن کرتے کرتے مارے گئے تھے۔ یہ یتیم بچے جب ناچتے ناچتے تھک کر گر جاتے تھے تو ان کو یتیم بنانے والے قاتل اسٹیج پر تالیاں بجا بجا کر انھیں اور بھی ناچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

جشن قبرستان کے ختم ہوتے ہی ہر طرف اندھیرا پھیلنا شروع ہوا اور خوفناک

آوازوں کے ڈر سے لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔ دادا جی جب بچوں کے ساتھ واپس گھر میں داخل ہو گیا تو قیصر، دادا جی کو پانی پلاتے ہوئے پوچھ بیٹھا "دادا جی! اس ظالم اندھیرے سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہے کہ نہیں؟" دادا جی نے فرش پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا:

"ہاں میری آنکھوں کے تارو...... اندھیرے کو بھگانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ بستی کے گھر گھر سے روشنی کی مشعلیں جل اٹھیں۔ ہر انسان بیدار ہو جائے اور اپنے اندر پوشیدہ خودداری کے جذبے کو ابھارے" یہ کہتے ہوئے دادا جی نے روشن مشعل ہاتھ میں اٹھائی اور گرج دار آواز میں کہا:

"اور جب...... کوئی انسان...... انقلاب کی روشن مشعل ہاتھ میں اٹھا کر منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اندھیرا...... شکست کھا کر بھاگ جاتا ہے۔"

دادا جی کی اس انقلاب انگیز تقریر نے بچوں کے دل سے بھیانک اندھیرے کا خوف نکال دیا اور وہ کھڑا ہو کر روشن مشعل کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے یک زبان ہو کر بول پڑے۔

"دادا جی...... ہم سب روشن مشعل اٹھا کر بھیانک اندھیرے کو اپنی بستی سے بھگا دینے کی قسم کھاتے ہیں۔"



ببول کے کانٹے

پرنسپل کے ٹیبل پر کالج کی تمام ضروری فائلیں تہہ در تہہ پڑی ہوئی تھیں اور پرنسپل ایک ایک کر کے فائلوں کو چیک کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور چہرے پر مایوسی کے آثار نمایاں تھے۔ تمام فائلیں صحیح ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں پرنسپل کچھ زیادہ ہی ڈپرس دکھائی دے رہا تھا حالانکہ چند دنوں پہلے ہی بہترین کارکردگی کے اعتراف میں U.G.C کی ٹیم کی طرف سے اس کالج کو "Grad-A" کے زمرے میں لایا گیا تھا اور خود پرنسپل کو، اس کی ایمانداری اور اپنے پیشے میں اچھی کارکردگی کے عوض کئی ایوارڈز سے نوازا گیا تھا۔ اُس کے بہت سارے شاگرد اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور انھیں پرنسپل کے شاگرد ہونے پر فخر تھا۔ لیکن آج اُسے سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ جس کالج میں وہ شان سے قدم رکھتا تھا آج کالج کے احاطے میں قدم رکھتے ہوئے اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کسی بڑے قید خانے میں داخل ہو رہا ہے اور اُس کا آفس جیل کا پنجرہ بن گیا ہے اور وہ خود کوئی بڑا مجرم ہے جس کو آج سزا ملنے والی ہے۔ اُس کا ذہن اُستاد کے مقدس پیشے کے بارے میں سوچنے لگا کہ سماج میں استاد کا رتبہ سب سے برتر مانا جاتا ہے اور قوم کو بنانے میں ایک استاد کلیدی رول ادا کرتا ہے اور

اُس کی تعلیم وتربیت ہی سے ایک آدمی، انسان؛ بن جاتا ہے۔ پرنسپل کا ذہن ابھی اسی ادھیڑ بن میں الجھا ہوا تھا کہ چپراسی نے آفس میں داخل ہو کر منسٹر کے آمد کی اطلاع دے دی۔ یہ سنتے ہی اُس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔

آج وزیرِ تعلیم کو کالج کا دورہ کرنا تھا۔ وزیرِ تعلیم نے چند مہینے پہلے ہی اپنی وزارت کا قلمدان سنبھالا تھا اور یہ اُس کا پہلا دورہ تھا۔ یہ منسٹر چند سال پہلے اس کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ وہ ایک بڑے سیاسی لیڈر کا لڑکا تھا اور کالج میں ہمیشہ غنڈہ گردی کرتا رہتا تھا۔ کئی بار کالج کے اسٹاف اور اسٹوڈنٹس نے پرنسپل کے سامنے اُس کی غیر شائستہ حرکتوں کی شکایت کی اور پرنسپل بھی اُس کو سُدھرنے کی نصیحتیں کرتا رہا لیکن وہ اپنی بُری عادت سے باز نہیں رہا۔ آخر کار ایک دن اُسے کالج سے نکالا گیا وجہ یہ تھی کہ امتحان کے دوران جب اُسے نقل کرنے سے روکا گیا تو وہ غنڈہ گردی کرنے پر اتر آیا اور پرنسپل کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ یہ غنڈہ گردی کی انتہا تھی۔ اُسے پولیس کے حوالے کیا گیا اور ساتھ ہی بیڈ کریکٹر کی سرٹیفکیٹ بھی اُس کے ہاتھ میں تھما دی گی۔

وقت گزرتا گیا۔ الیکشن کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ایک سیاسی پارٹی کی طرف سے اُسے منڈیٹ ملا اور الیکشن جیتنے کے بعد اُسے وزیرِ تعلیم بنایا گیا۔

منسٹر بڑے کروفر کے ساتھ پرنسپل کے آفس میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ دوسرے کئی بڑے افسران بھی تھے۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے کالج کا ریکارڈ طلب کیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک افسران نے ان فائلوں کا بغور جائزہ لیا۔ تمام افسران نے ریکارڈ صحیح ہونے کی تصدیق کی اور اپنی رپورٹ منسٹر کے سیکرٹری کے حوالے کر دی۔ سیکرٹری نے یہ رپورٹ منسٹر کو تفصیلاً بتا دی۔ رپورٹ سننے کے بعد منسٹر نے پرنسپل سے تیز لہجے میں پوچھا:

"ہمارے پاس شکایت آئی ہے کہ اس کالج میں نقل کی وبا پھیل چکی ہے۔ امتحان کے دوران ہر ایک لڑکے سے پیسہ لیا جاتا ہے اور پھر انھیں نقل کرنے کی چھوٹ دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس کالج کا رزلٹ دوسرے کالجوں کے مقابلے میں ہمیشہ اچھا نکلتا ہے آپ لوگ سرکاری کرسی کا غلط استعمال کرتے ہو۔"

"یہ سراسر غلط الزام ہے، اس کالج کا جو بھی طالب علم اچھے نمبرات لے کر پاس ہو جاتا ہے وہ اساتذہ کی محنت اور اس طالب علم کی قابلیت کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ نقل کرنے کی چھوٹ۔ ویسے تو آپ خود اس بارے میں اچھی طرح سے جانتے ہیں۔" پرنسپل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ وضاحت کردی۔

یہ سنتے ہی منسٹر کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہوگیا اور پرنسپل کو معطل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ایک پریس رپورٹر نے جب اس معاملے پر پرنسپل سے کچھ کہنے کو کہا تو پرنسپل نے اپنے آفس سے نکلتے ہوئے کہا۔

"جمہوریت ایک ببول پیڑ کی طرح ہے جس کے نوکیلے کانٹوں کو عوام جانے انجانے میں اپنے ووٹوں سے تاج کی صورت عطا کرتے ہیں اور کاغذی پیرہن پہنے ہوئے لوگ صرف زخمی ہو جاتے ہیں۔"



ٹوٹتی جوانیاں

پبلک سروس کمیشن کی طرف سے سلیکشن لسٹ ، جو ایک مقامی نیوز پیپر میں مشتہر ہوا تھا، میں اپنا نام دیکھ کر میں بے حد خوش ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد میری پوسٹنگ شہر سے باہر وادی کے ایک دور افتادہ علاقے گلشن آباد کی گئی۔ ویسے تو میری خواہش شہر میں تھی لیکن میں پھر بھی مایوس نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ ایک نسبت سے اچھا ہی ہوا۔ اس طرح اپنی اس گلپوش وادی کے پورے حُسن سے محظوظ بھی ہونگے اور دور افتادہ علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے رہن سہن اور زندگی گزارنے کے طور طریقوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملے گا۔ دیہاتی لوگوں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ دیہات میں ایک دہائی گزارنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اگر سادگی، ہمدردی، بھائی چارہ، خلوص اور شرم وحیا کو اُسکے فطری صورت میں دیکھنا ہو اور ان انسانی خصائل کا حقیقی مشاہدہ کرنا ہو تو دیہات میں جانا چاہیئے۔ ویسے تو شہر میں بھی یہ چیزیں ناپید نہیں ہیں لیکن گاؤں کے مقابلے میں شہر کی فضا ہی ایسی ہے کہ یہاں مصنوعیت اور مسابقت کا کچھ زیادہ ہی دور دورہ ہے۔

میری پوسٹنگ گلشن آباد کے پوشہ پورہ گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ہوئی۔

رات ۔کے آٹھ بجے میں اسپتال پہنچا۔ میں چوکیدار سے چابی لے کر سیدھے کوارٹر میں داخل ہوا۔ اپنا لوگیج وغیرہ کمرے میں رکھ کر پہلے میں نہایا، کچھ دیر کے بعد چوکیدار نے کھانا وغیرہ تیار کیا اور کھانا کھانے کے بعد سو گیا۔صبح سویرے جاگنے کے بعد میں نے کمروں کی صفائی کروائی ۔قریباً دس بجے لوگوں کا ایک ہجوم اسپتال کے صحن میں نمودار ہوا۔ چوکیدار میرے کمرے میں حاضر ہو کر بولا ''صاحب! گاؤں کے لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔'' میں نے چوکیدار سے کہہ کر انہیں اسپتال کی پارک میں ٹھہرایا۔ میں کپڑے تبدیل کر کے میڈیسن کا بیگ ہاتھ میں اٹھا کر پارک میں آ گیا۔ پارک میں داخل ہوتے ہی گاؤں کی عورتوں نے گلابی پھولوں سے میرا استقبال کیا۔ تمام لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ سب سے پہلے میرے سامنے دودھ پیش کیا گیا ۔اس کے بعد ایک بڑا ٹوکرا سامنے رکھا گیا۔ جس میں مختلف قسم کے پھل، سبزیاں، انڈے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ مجھے اجنبیت کا قطعی احساس نہیں ہوا۔ میں نے اپنا تعارف کرنے کے بعد تمام گاؤں والوں کا شکریہ ادا کیا۔ گاؤں کے ایک بزرگ ماسٹر نے اپنا تعارف کرنے کے بعد تمام لوگوں کا تعارف کرایا۔

دن گزرتے رہے۔ میں دن بھر اخبارات اور رسائل پڑھنے میں مشغول رہتا تھا۔ کبھی کبھار ہی کوئی مریض اسپتال میں آتا تھا۔ گاؤں کے لوگ کافی محنتی ہوتے ہیں ۔وہ دن بھر کھیتوں میں کام کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا جسم چُست رہتا ہے ۔ان کی خوراک تازہ سبزیاں، چاول اور پھل ہوتے ہیں اسی وجہ سے گاؤں میں رہنے والے لوگ کم ہی بیمار پڑتے ہیں۔ ایک صبح جب میں ابھی بستر پر ہی لیٹا ہوا تھا کہ باہر سے ہر طرف چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں جلدی بستر سے اٹھا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ اسپتال کے احاطے میں گاؤں کے تمام لوگ جمع تھے۔ میں نے بہت

ساری لڑکیوں کو رسیوں سے باندھا پایا۔ لڑکیاں پاگلوں کی طرح اپنے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کر رہی تھیں اور عجیب وغریب آواز میں "دیکھو ہمارا یہ گلستان جس کی ہم ہیں کلیاں" گارہی تھیں۔ میں یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر بدحواس سا ہوگیا اور دوڑتے ہوئے ان لوگوں کے پاس پہنچا "یہ سب کیا ہیں" میں نے طیش میں آکر ایک نوجوان کو تھپڑ مارتے ہوئے پوچھا۔ اسکول ماسٹر جلدی سے سامنے کھڑا ہوا اور تیز لہجے میں بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! پہلے آپ ان سب لڑکیوں کو بے ہوشی کا انجکشن لگائے۔ بعد میں ہم بتادینگے۔"

ان لڑکیوں کا علاج کرنے میں پورا دن گزر گیا۔ دن بھر میں سوچتا رہا کہ ان سیدھے سادھے اور ملنسار لوگوں کو کس آفت نے آج گھیر لیا اور یہ مصیبت ان پر کیوں ٹوٹ پڑی۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ تقریباً تمام لڑکیاں اپنی اصلی حالت میں آگئیں۔ میں کوارٹر میں چلا گیا۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد میں بیڈ پر تھکان دور کرنے کے لئے لیٹنے ہی والا تھا کہ گاؤں کا بزرگ ماسٹر اپنی جوان سال بیٹی کو ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ میں اس دلدوز واقع کی وجوہات جاننے کے لئے ویسے ہی بے قرار تھا اس لئے میں ماسٹر سے جلد ہی پوچھ بیٹھا "ماسٹر جی! یہ کیا ماجرا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ میں اس گاؤں میں ہمیشہ انسان دوستی، بھائی چارہ، امن وامان اور انسانیت ساز ماحول دیکھتا آیا......لیکن......؟

ماسٹر جی میری بات کاٹتے ہوئے روتے روتے کہنے لگا۔

"یہ میری جوان بیٹی ہے۔ یہ لگ بھگ پچیس برس کی ہے جن دوسری لڑکیوں کا علاج کرنے میں دن بھر آپ مصروف رہے۔ وہ چالیس لڑکیاں بھی تقریباً اسی عمر کی ہیں۔"

''لیکن ان سب لڑکیوں کی یہ حالت آج ہی کے دن ایک ساتھ کیسے ہوئی؟''
میں نے ماسٹر جی کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔
میرے پوچھنے پر ماسٹر جی کی بیٹی زاروقطار رونے لگی اور اپنے لوگوں کی دردبھری کہانی سنانے لگی۔
''ڈاکٹر صاحب! آج ''یوم فتح'' کی تاریخ ہے۔ آج ہی کے دن ہمارا اعظیم گلستان غیروں کی غلامی سے آزاد ہوا ہے۔ اسی دن...... ہاں...... اسی یوم فتح کے دن...... بیس سال پہلے، جب میری عمر سولہ برس تھی ہم لوگ یوم فتح کا جشن منا رہے تھے، اپنے والد صاحب کے ساتھ ایک مہینے تک میں گاؤں کی لڑکیوں کو یوم فتح کے دن پروگرام پیش کرنے کی تیاریوں میں مصروف رہی۔ یوم فتح کی تقریب منانے کے سلسلے میں تمام گاؤں والے اسپتال کے وسیع گراونڈ میں موجود تھے۔ گلستان کے پاسبان اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فتح کا پرچم لہرایا گیا۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ میں گاؤں کی لڑکیوں کو فتح کے گیت پڑھا رہی تھی۔ لڑکیاں بھی ترنم کے ساتھ بلند آواز میں ''دیکھو ہمارا یہ گلستان جس کی ہم ہیں کلیاں'' گا رہی تھیں کہ اچانک زور دار زلزلہ آیا۔ بہت سارے گاؤں والے اور کچھ پاسبان اس زلزلے میں مر گئے۔ چار سو سناٹا چھا گیا۔ ہم یوم فتح کا جشن منا رہے تھے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ زلزلہ کیسے ہوا۔ تمام پاسبان حواس باختہ ہو گئے۔ جو لوگ ابھی تک اسٹیج پر ہماری امن پرستی کی قسمیں کھا رہے تھے۔ اچانک انہیں ہم سب سے بڑے امن دشمن نظر آنے لگے۔ تمام بستی کھنڈرات میں تبدیل ہو گئی۔ گلستان کے پاسبانوں نے سرعام لوٹ مار اور بربریت کا ننگا ناچ کھیلا اور نازک کلیوں کو ظالم گلچیں نے مسل کر رکھ دیا۔'' ماسٹر جی کی بیٹی اس انسانیت سوز سانحہ کا ذکر کرتے ہوئے بے ہوش ہوئی اور فرش پر گر پڑی۔ ہم نے اُسے بیڈ پر لیٹا دیا۔ ''ڈاکٹر صاحب! یہ ہے

اس سانحہ کی روداد۔'' ماسٹر جی نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔'' پچھلے بیس برسوں سے گاؤں میں کسی بھی لڑکی کی ڈولی نہیں اٹھی کیونکہ گلستان کے دلیر پاسبانوں نے ان کی عزت لوٹ کر جو سیاہ دھبے ان کے پاک دامن پر لگا دیئے۔ زمانے کی گردش نے ابھی تک وہ صاف نہیں کیئے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے 20 برسوں سے ظلم کا شکار ہوئی ہماری لڑکیاں یوم فتح کے دن اپنے حواس کھو بیٹھتی ہیں اور ہمیں مجبوراً انہیں رسیوں سے جکڑنا پڑتا ہے۔'' ماسٹر جی کی بیٹی بے ہوشی کے عالم میں '' دیکھو ہمارا گلستان جس کی ہم ہیں کلیاں'' گا رہی تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ آج محبت سے نہیں بلکہ نفرت کی وجہ سے یہ پڑھ رہی ہے اور اُسکے دل میں انتقام کا آتش فشاں پک رہا ہے۔

کیا کہوں کس طرح سر بازار
عصمتوں کے دیے بجھائے گئے
(ناصر کاظمی)



نشیب و فراز

وہ ذہین تھا اور باہمت بھی، اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے علاقے کا پہلا گریجویٹ تھا، ہائی اسکول سے لے کر کالج تک وہ اپنی قابلیت کے جوہر دکھا چکا تھا لیکن اب وہ چاہتے ہوئے بھی مزید تعلیم حاصل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک بے حد غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والدین باہمت تو تھے لیکن سفید پوش بھی تھے۔ ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا، ایک منزلہ پرانا بوسیدہ مکان، اس کے والدین کی کل پونجی تھی۔ خود منظور استاد بننا چاہتا تھا، پڑھ لکھ کر جو حاصل کیا تھا دوسروں کے ساتھ بانٹنا چاہتا تھا۔ خود تو اُس کے گھر میں اندھیرا تھا لیکن وہ اپنے علم کی روشنی سے دوسروں کے گھروں کو منور کرنا چاہتا تھا۔ استاد بننا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اس بارے میں صرف سوچ سکتا تھا کیونکہ سوچ انسان کی ذات سے تعلق رکھتی ہے کوشش تو وہ کرتا رہا۔ درخواستیں بھی دیتا رہا، انٹرویوز میں بھی شامل ہوتا رہا، ممکنات کو ناممکنات اور ناممکنات کو ممکنات میں تبدیل ہوتے بھی دیکھتا رہا، لیکن...... آنے والے ہر لمحے کے ساتھ وہ گھبرا اٹھتا، اس کی ہمت اور ذہانت جواب دینے لگتی اور پھر اوراتج ہونے کا خوف اور ڈر...... اب کی بار وہ اپنے گھر سے بہت دور چلا آیا تھا، انٹرویو میں شامل ہونے کے لئے

...... اُستاد بننے کے لئے ...... لیکن اس انٹرویو میں اُس نے بہت اچھی کارکردگی دکھائی۔ سب سے الگ...... سب سے اعلیٰ، اسے یقین تھا کہ اب کی بار استاد بننے میں اسے کوئی نہیں روک سکتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یقین تو انسانوں پر کیا جاسکتا ہے پتھروں پر نہیں، بندے جب خدا بن جاتے ہیں تو سارے نظام میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ نتائج نکلے، لسٹ میں اپنا نام نہ دیکھ کر وہ حیران تو نہ ہوا لیکن مایوس ضرور ہوا۔ انٹرویو لینے والوں نے اس کے لئے جو شیرین الفاظ دہرائے تھے وہ زہر ہلاہل کی طرح اس کے شریانوں میں خون کے بدلے گردش کر رہے تھے، اسے قوم کا روشن ستارہ کہنے والوں کے چہروں سے مصنوعی نقاب اتر چکا تھا۔ ان کے اصلی چہرے اب منظور کے سامنے تھے......!

گھر لوٹتے سمے وہ سوچ رہا تھا خودکشی کے بارے میں، اس وحشی نظام سے بغاوت کرنے کے بارے میں...... وہ سوچ رہا تھا کہ جو لوگ رشوت، بے ایمانی اور لوٹ کھسوٹ جیسی برائیوں کو سماج سے ختم کرنے کے لئے بڑی بڑی اور سماج سُدھار محفلوں میں مہمانِ خصوصی ہوتے ہیں، دراصل یہی لوگ ان برائیوں کو پھیلاتے ہیں، دھوکہ دہی، ضمیر فروشی اور بے ایمانی اُن کے زندگی کے حصے ہیں، ان کے اصول ہیں......!

ٹوٹتے قدموں سے جب وہ گھر پہنچا تو اُس کے چہرے پر چھائی اُداسی سے سارے گاؤں والے بھی اُداس ہوگے۔ سارے گاؤں میں مایوس کُن خاموشی چھاگئی لیکن ایک بزرگ نے یہ کہتے ہوئے خاموشی توڑ دی...... ''منظور اُستاد بنئے گا۔''

''وہ کیسے؟'' کسی نے پوچھا۔

''ہم اپنے گاؤں میں اسکول کھولیں گے...... وہ ہمارے بچوں کو پڑھائے گا۔''

"یہ کیسے ممکن ہے، اس کے لئے پیسہ چاہئے، روپیہ چاہئے۔" کسی اور نے جاننا چاہا۔

"اس کا انتظام ہم مل جل کر کریں گے۔"

تمام گاؤں والوں نے چندہ جمع کیا۔ عورتوں نے اپنے گہنے پیش کئے اور اس طرح سے ایک اسکول وجود میں آیا۔

یہ اب سے بیس برس پہلے کی بات ہے، وہ چھوٹا سا اسکول اب ایک ہائی اسکول میں تبدیل ہو چکا ہے اور منظور اس اسکول میں آج ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے...... اب اس گاؤں میں کوئی ان پڑھ نہیں، گنوار نہیں، منظور کی ذہانت، محنت، شجاعت اور قابلیت سے سارا گاؤں تعلیمی نور سے منور ہو چکا ہے......!!



قتل، قاتل اور مقتول

گولیوں سے چھلنی لاش صحن میں پڑی تھی۔ اُس کی اندھی ماں اور ضعیف باپ بیٹے کے قتل کی منحوس خبر سنتے ہی اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے تھے۔ بیوی کے آنکھوں سے گرنے والے محبت و جدائی کے آنسو اپنے شوہر کے خون آلودہ چہرے کو صاف کرتے ہوئے قاتلوں سے فریاد کرر ہے تھے کہ ان کے بے گناہ شوہر کو کس بناء پر اس بے دردی کے ساتھ قتل کیا گیا۔ اُس کی چار سالہ پھول جیسی بیٹی اپنے باپ کی لاش سے چمٹ گئی تھی اور ان حالات سے بے خبر کہ اُسے اب یتیم کہا جائے گا اپنے باپ سے سیب مانگ رہی تھی۔

وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے والدین کی مفلسی کی وجہ سے اسے اپنی تعلیم کے آٹھویں دروازے پر ہی تالا لگانا پڑا۔ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد جب اُس نے اپنے آس پاس نظریں دوڑائیں تو اسے احساس ہوا کہ بچپن کا حسین سفر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی مٹھی میں قید ہو چکا ہے اور اب جو سفر شروع ہو چکا

ہے وہ بے حد دشوار اور کٹھن ہے، اپنی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ اب والدین کی دیکھ بھال بھی اس کی ذمہ داری بن چکی ہے، یہ دنیا جو سب کے لئے وسیع ہے اس کے لئے سکڑ چکی ہے، گھر سے کھیت کھلیانوں تک سمٹ چکی ہے، اپنا اور اپنے ضعیف والدین کا پیٹ بھرنے کے لئے وہ صبح سے شام اترنے تک دوسروں کے کھیتوں میں کام کرتا تھا، کبھی کبھار جنگلوں کی جانب بھی چل پڑتا اور قریب کے جنگل سے جلانے کی لکڑیوں کا ایک انبار اپنے کاندھوں پر لاد کر شہر جا کر فروخت کرتا اور اُن پیسوں سے گھر کی ضروریات کی چیزیں خرید کر لاتا......ان جنگلوں میں جا کر اسے عجیب سا سکون ملتا تھا، یہاں کی ہریالی میں اُسے زندگی کی سچائی نظر آتی تھی۔

لیکن......ایک روز......سب کچھ بدل گیا۔ وقت کب بدلے گا انسان کی سوچ سے باہر ہے۔ زندگی کی سچائی جل کر راکھ ہوئی، نہ صرف غفار کے لئے بلکہ سب کے لئے، اس کے گاؤں کے لئے، اس کی وادی کے لئے......خوف و ڈر کے اندھیاروں نے وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اجالوں کو چاہنے والے تاریکیوں میں ڈوب گئے......ایک آواز ابھری، یہ آواز سب کے لئے نئی تھی، اجنبی تھی یہ آواز بندوق سے نکلنے والی گولی کی تھی! جس کے سامنے سب بے بس دکھائی دے رہے تھے۔

یہ آواز سن کر غفار بھی ڈر گیا، سہم گیا......سہما سہما، ڈرا ڈرا سا وہ قریب کے جنگلوں میں جاتا رہا، لکڑیوں کی تلاش میں، ہریالی کی تلاش میں......وہ دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں بھی جاتا رہا......اس ڈر اور خوف سے نہ تو وہ اپنا پیٹ بھر سکتا تھا اور نہ ہی اپنے گھر والوں کا......!

اُس شام چاروں اور سناٹا سا چھایا ہوا تھا، آفتاب کب کا غروب ہو چکا تھا، وہ فصل کاٹتے کاٹتے تھک چکا تھا اور اب گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اُس نے جونہی

سیبوں سے بھرا تھیلا ہاتھ میں اٹھایا تو اُس کے سامنے کچھ لوگ ہتھیار تھامے ہوئے نمودار ہو گئے اور غفار کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"کون ہو تم" وہ خوف زدہ ہو کر چلاتا رہا۔

"آزادی کے متوالے" ایک آواز سنائی دی۔

"آزادی، کیسی ...... آزادی ...... کس کی آزادی ...... اگر تم واقعی آزادی کے متوالے ہو تو مجھے کیوں اپنی گرفت میں لے رکھا ہے ...... مجھے آزاد کرو اور مجھے گھر جانے دو......"

"نہیں ہم دہشت گرد ہیں۔" دوسری آزاد سنائی دی "ہمارا ایک ہی مقصد ہے، زندگی چھیننا، لہلہاتے کھیتوں کو مسمار کرنا۔"

"نہیں ان کھیتوں کو مسمار مت کرو...... شاید تم بھوک سے واقف نہیں، بھوک جب بڑھتی ہے تو جرائم جنم لیتے ہیں۔"

"ہم نہ تو دہشت گرد ہیں اور نہ ہی آزادی کے متوالے" تیسری آواز آئی "ہم تم لوگوں کی حفاظت کے لئے آئے ہیں۔"

"کیسی حفاظت کرتے ہو تم ......کون کرتا ہے یہ خون خرابہ...... تمہاری بندوقیں یہ کیسی آگ اُگلتی ہے کہ معصوموں کو جلا کر ہمیشہ کے لئے فنا کر دیتی ہے......"

"ختم کر ڈالو اس کو" تینوں آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں،

"یہ مخبر ہے، سب کی خبر رکھتا ہے، سب کی باتیں سنتا ہے" لیکن مخبری کس کے لئے کرتا ہے یہ کوئی نہیں جانتا۔

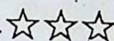
"نہیں میں مخبر نہیں ہوں، میں ایک کھیت مزدور ہوں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو...... کہاں چھپا رکھے ہیں ہتھیار؟"

”میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے، صرف ایک درانتی، گھاس کاٹنے والی درانتی۔“

دوسری صبح خون میں لت پت غفار کی لاش ان ہی کھیتوں میں ملی، اُس نے اپنے ہاتھوں میں درانتی کی جگہ بندوق تھام رکھی تھی ۔

دیکھو گے تو ہر موڑ پر مل جائیں گی لاشیں
ڈھونڈو گے تو اس شہر میں قاتل نہ ملے گا



مقبول

جنتِ نظیر کا وہ اسیر پرندہ...... بے بسی و بے کسی کا کفن اوڑھے......ظالم دیوؤں کی کالی کوٹھری کی سلاخوں والی روزن سے جب ابھرتے سورج کی آزاد شاعوں کو ضو افشانی کرتے ہوئے دیکھتا تھا تو وہ آزادی کے خواب کو حقیقت میں بدلتے ہوئے محسوس کرتا تھا۔ آزادی......ہاں......آزادی......اپنے وطن کے خوبصورت چمنستانوں کی آزادی ، فلک بوس پہاڑوں کی آزادی ، آب حیات جیسی تاثیر رکھنے والے آبشاروں کی آزادی......اپنے محکوم و مظلوم ہم وطنوں کی آزادی، جن کے ذہن ظلم و ستم کے پہاڑوں تلے دب گئے تھے ۔ جن کی دھڑکنوں پر خوف و دہشت کے پہرے بٹھادئے گئے تھے اور جن کے پُرخون آنسوؤں سے ظُلم کے ایوانوں کے چراغ روشن کئے جارہے تھے۔ وہ گمنامی کے عالم میں ایک گمنام وطن پرست سپاہی کی طرح وطن پرستی کا حق ادا کررہا تھا۔ وہ ایک مقصد کے تحت اس پر کٹھن راستے پر چل پڑا تھا۔ ہر ستم اُس کے حوصلے کو بڑھاوا دیتا تھا۔ اس کا مقصد اُس کے اعتماد کے سہارے مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جارہا تھا اور اس کے اعتماد کی بنیاد اُس کے ایمان پر تھی ۔ اپنے ساتھیوں کو

وہ ہمیشہ یہی پیغام دیتا رہتا تھا کہ وہ جس ایمان پر قائم ہیں اُس نے صدیوں پہلے انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد ہونے کا منشور پیش کیا تھا۔ زندان کی زنجیروں کا بوجھ، اُس کے ایمان واعتماد کے وزن کو بڑھاتا رہتا تھا۔ اسکی زندگی سلسلہ واران تہہ خانوں میں ہی گزری تھی لیکن اس نے کبھی بھی اپنے مشن کو سودا بازی کے ترازو میں نہیں تولا۔

وہ ایک باشعور تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ پولیٹکس میں ڈگری یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ سیاسی طور بالغ نظر انسان تھا۔ وہ محکوموں کی المناک داستان سے بھی باخبر تھا اور حاکموں کے عشرت خانوں کی خوشحالی سے بھی واقف تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ آزاد قومیں ہمیشہ خودداری اور پُر اعتمادی کے ساتھ ارتقاء کی منزلیں طے کرتی رہتی ہیں اور ان کی نسلیں، فاتحانہ سوچ کے ساتھ آگے کی جانب قدم بڑھاتی رہتی ہیں۔ وہ جب روزنِ زنداں کی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر باہر کے اور دیکھتا تھا تو اُسے پھانسی کے پھندے کے درمیان چمکتا ہوا سورج دکھائی دیتا تھا اور جب سورج کی روشن کرنیں اُس کی خواب پسند آنکھوں سے ٹکراتی تھیں تو اس کے بیدار ذہن میں اپنی محکوم وادیٔ کا آزاد جغرافیہ گھومنا شروع ہو جاتا تھا۔ وہ گھنٹوں سوچتا رہتا کہ اس کی قوم خواب غفلت میں پڑی ہوئی ہیں اور غلامی کا دیمک ان کے ذہن سے آزاد پسندی کی روح کو کُور کُور کر نکال رہا ہے لیکن وہ اس بات سے زیادہ پریشاں نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ طویل غلامی کا لمبا سانپ غلاموں کی آزادی پسندی کے مزاج کو اس قدر ڈستے کڑوا بنا دیتا ہے کہ وہ آزادی کی مٹھاس سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور ان کی آزاد فکر پر غلامی کی دبیز چادر بیٹھ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ غلامانہ ذہنیت کے مالک بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کی غفلت شعاری سے پریشان تو ہو جاتا تھا لیکن اس کا اعتماد اُسے مایوسی سے بچاتا تھا اور اس کی نظریں اپنی قوم کی نئی نسل پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جن کے لئے

اُس نے آزادی کے پُل کی بنیاد ڈالی تھی۔

وہ کافی عرصہ سے جمہوریت کے قید خانے کا قیدی بنا ہوا تھا۔ جمہوریت کے دعویداروں کی نظروں میں وہ ملک دشمن باغی تھا، کیونکہ ان کے نزدیک وہ خفیہ طور پر آزادی کے مشن کو پھیلانے کی کوشش کر رہا تھا اور نوجوان نسل کے ذہنوں میں آزادی کی روح پھونک رہا تھا۔ سیاہ وسفید کے مالک فاتح اس کے منصوبہ کو بھانپ چکے تھے۔ انھوں نے اس کی آزادی پسند سوچ کو ہر ممکن بدلنے کی کوشش کی لیکن جب ظلم وستم کے تمام ہتھکنڈے ناکام ثابت ہوئے تو اُس پر ملک دشمنی کا مصنوعی لیبل لگایا گیا اور پھانسی کی سزا تجویز کی گئی، لیکن موت کی سزا سننے کے باوجود بھی اُس کی ہمت کبھی نہیں ٹوٹی اور وہ آزادی کے مشن پر مضبوط چٹان کی طرح ڈٹا رہا۔

وہ دن...... اُس کی انقلابی زندگی کا آخری دن تھا جب جدید دور کے جمہوریت پرست چنگیز نے اپنی چنگیزیت کا بھرپور مظاہرہ کرکے غلام وادیٔ کے آزاد پسند انسان کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ نیا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس کی چمکتی کرنوں نے، آہستہ آہستہ سخت گرمی کی منجمد فضا میں آگ کے شعلے بھڑکا دے۔ بے حس قوم کے احساس جاگ اٹھے اور بیداری کی گرم لہر چارسو پھیل گئی۔ تمام قوم پل بنانے میں جُٹ گئی۔ طوفان کی خونین لہروں نے مشن چلانے والوں کو نگلنا شروع کر دیا لیکن ان کے انقلابی قدم آگے بڑھتے گئے اور ان کے انقلاب آفریں صداؤں سے ساری وادی گونجنے لگی۔ خوفناک بجلیاں کڑکنے لگیں لیکن انقلابی آواز کی زنجیر لمبی ہوتی گئی۔ ہر دل سے صدا نکل رہی تھی مقبول، مقبول...... تیرا مشن ہمیں قبول۔

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے (فیضؔ)

ڈپریشن

شب ظلمات کا نصف سے زیادہ حصہ بیت گیا تھا۔ صابر کی ماں نے لالٹین کی بتی جلائی اور صابر کو نیند سے جگاتے ہوئے کہنے لگی "صابر بیٹا اُٹھو نا، جلدی کرو نہیں تو دیر ہو جائے گی، پھر شہر کیسے جاؤ گے۔"

صابر تیس برس کا نوجوان ...... پوسٹ گریجویٹ ...... عجیب قسم کے ذہنی تناؤ کا اسیر ..... شہر جانے والی گاڑی خوفناک آواز میں ہارن بجا بجا کر سواریوں کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔ لوگ گھپ اندھیرے میں بس کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ صابر جب گاڑی میں سوار ہوا تو گاڑی سواریوں سے کھچا کھچ بھری پڑی تھی۔ اُسے مشکل سے بیک سیٹ پہ جگہ مل گئی۔ سانسیں درست کرنے کے بعد اُس نے بغل والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا:

"بڑی مشکل سے سیٹ مل گئی۔ حاکم الوقت عوام کی مشکلات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتے، ہر وقت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" پاس میں بیٹھا ہوا آدمی قریباً ستر برس کی عمر کا تھا وہ صابر کی بات سُن کر بڑی سنجیدگی سے بولا:

''نوجوان! ہم کون سا کام اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے ہیں۔ نصف صدی سے لوگ اس بس میں سفر کرتے آئے ہیں۔ اس زنگ آلودہ بس کے زہر آلودہ ماحول میں سفر کرتے ہوئے دم گھٹتا ہے۔ نہ جانے کتنے مسافر منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی اس بس میں دم توڑ بیٹھے۔ خیر آپ شہر کیوں جا رہے ہیں۔'' اُس آدمی نے صابر سے پوچھا'' آپ کے چہرے سے تو پسینے چھوٹ رہے ہیں خیریت ہے نا؟''

''جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے تب سے میں عجیب و غریب ذہنی تناؤ میں مبتلا ہوں'' صابر نے درد بھری آواز میں کہا'' سنا ہے کہ شہر کے ایک اسپتال میں دنیا کے پانچ بڑے ماہرین نفسیات نے ایک بڑا کیمپ لگایا ہے۔ جہاں پر وہ ڈپریشن کے شکار انسانوں کا نفسیاتی معائینہ کرتے ہیں تا کہ وہ ذہنی تناؤ سے چھٹکارہ پا کر سکون کی سانس لے سکیں۔''

اسی دوران ڈرائیور اور کنڈیکٹر بس میں نمودار ہو گئے۔ ڈرائیور کے ماتھے پر لمبا سرخ ٹیکا تھا اور کنڈیکٹر کے چہرے پر لمبی داڑھی تھی۔ دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک لمبا کوڑا تھا...... بس شہر کی جانب چل پڑی، ہر طرف خوف کا سناٹا چھایا ہوا تھا، موسم اگرچہ خوشگوار تھا، پرندے بھی آزاد فضاؤں میں اُڑ رہے تھے لیکن بس کی بدبودار فضا سے مسافر سخت کوفت محسوس کر رہے تھے۔ گھٹن سے تنگ آ کر کچھ نوجوانوں نے بس کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کو کھولنے کی کوشش کی تا کہ سڑک کے دونوں جانب پھیلی ہوئی پہاڑیوں سے آ رہی ٹھنڈی اور خوشبودار ہوائیں مسافروں کی گھٹن کم کر سکیں۔ لیکن ...... ابھی نوجوان کھڑکیاں کھولنے ہی لگے تھے کہ اچانک بس رُک گئی اور ڈرائیور اور کنڈیکٹر نے ان نوجوانوں پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ بس میں افراتفری مچ گئی۔ بہت سارے نوجوان، بوڑھے، بچے اور عورتیں کوڑوں کی مار سے اپنی جانیں گنوا

بیٹھے، ہر طرف خون نظر آرہا تھا اور بس ایک جیل کا انٹروگیشن سیل محسوس ہو رہی تھی یہ وحشت ناک صورت حال دیکھ کر صابر کو دل کا دورہ پڑنے لگا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ بس کی پٹرول ٹینکی میں ان لوگوں کا خون جمع ہو رہا ہے اور اُسی خون سے بس آگے بڑھ رہی ہے۔

یہ سوچتے سوچتے صابر کو اپنے اسکول کے دن یاد آئے جب وہ پانچویں میں پڑھتا تھا اور ماسٹر جی روز انھیں مارننگ اسمبلی میں ایک نظم پڑھاتا تھا "ہم ہونگے کامیاب...... ہم ہونگے کامیاب...... ایک دن......" صابر نے ایک دن معصومانہ لہجے میں ماسٹر جی سے پوچھا تھا کہ ماسٹر جی اس نظم کا مطلب کیا ہے؟" ماسٹر جی نے بڑے پیار سے سمجھایا تھا "بیٹا جب تم پڑھ لکھ کر بڑے ہو جاؤ گے تو تمہیں اپنے لئے اور اپنے وطن کے لئے بہت کچھ کرنا پڑے گا تا کہ تمہارا وطن ترقی کر سکے اور لوگ آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔" صابر سوچتا رہا...... سوچتا رہا کہ ابھی ہمیں ہماری منزل نہیں ملی ہے...... ہمیں اور آگے بڑھنا ہے۔

بس شہر پہنچ چکی تھی۔ صابر نے بس سے اتر کر سیدھے اسپتال کی راہ لی۔ اسپتال میں وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ بس کے تمام مسافر نفسیاتی مرض میں مبتلا تھے اور وہ علاج کے لئے قطار میں کھڑے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ صابر بھی قطار میں شامل ہو گیا۔ وہ تمام چہروں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک عورت پاگل پن کا شکار لگ رہی تھی وہ چلا چلا کر دردناک آواز میں اپنے لڑکے کا نام لے رہی تھی اور کبھی کبھی بے ہوش ہو جاتی تھی کچھ لوگ اُسے زور سے پکڑے ہوئے تھے۔ صابر نے اس عورت کی قابل رحم حالت دیکھ کر ان لوگوں سے پوچھا کہ "اس عورت کی یہ حالت کیسے ہوئی ہے۔ اُسے ایسا کون سا صدمہ پڑا ہے جس سے یہ اپنا دماغی توازن تک کھو بیٹھی ہے۔"

ان لوگوں میں سے ایک آدمی نے اُس عورت کی درد بھری کہانی سناتے ہوئے کہا۔

''نوجوان! اس عورت کا ایک جوان لڑکا تھا...... اُس نے اچھی خاصی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کو خوشحال دیکھنا چاہتا تھا اور ان کی مشکلات کو دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ لوگوں کو بیدار کرنے کا متمنی تھا تا کہ ان کی آنے والی نسل آزاد فضاؤں میں سانس لے سکے۔ لوگ اُس بہادر اور انقلاب پسند نوجوان کے خیالات اور عزائم سے اتفاق کرنے لگے۔ ایک دن اُس نے اپنے علاقے کے لئے نئی بس لائی۔ لوگ اُس بس جوق در جوق سوار ہوتے گئے لیکن ابھی بس چند ہی میل کا سفر طے کر چکی تھی کہ برسوں پرانی چلنے والی بس کا ڈرائیور سڑک پر نمودار ہوا اور اُس نے بہادر نوجوان کو بس سے اتار کر کوڑے مار مار کر ابدی نیند سُلا دیا۔''

یہ درد بھری کہانی سن کر صابر کا سر چکرانے لگا اُس نے کھڑکی کھولی اور تازہ ہوا کے جھونکوں میں لمبی لمبی سانسیں لینے کی کوشش کی۔ اُسے یوں لگا کہ باہر سارے شہر میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ آسمان سے خون کی بارش ہو رہی ہے......لوگوں کی چیخ و پکار سے ساری وادی لرز رہی ہے......اور دور سڑک کے کنار اُس کا وہ بوڑھا ماسٹر جی بھی خون میں لت پت پڑا ہوا ہے جو اُسے بچپن میں ''ہم ہونگے کامیاب'' کی نظم پڑھایا کرتا تھا۔

کچھ دیر بعد صابر اُس چیخ و پکار میں خود بھی شامل ہو گیا تھا اور اُس کا ڈپریشن ......!!



تیسری جنگ عظیم سے قبل

وہ سنگ دل گلچیں ...... اپنے پُرفریب محدّب شیشوں کی زہریلی شاعوں سے ......گلِ زمین کے لالہ فام پھولوں کو اپنا نشانہ بنارہے تھے۔ چمنستان کے شاہین فطرت پرندے، اُن مردہ خور کرگسوں کی بدطینت خصلت بھانپ گئے اور اپنے چمنستان کو ان مردہ خوروں کی پروازوں سے آزاد کرانے کے لئے کمربستہ ہوگئے۔ چمنستان کے یہ شاہین جب ان مردہ خور کرگسوں کا مقابلہ کرنے کے لئے پر تولنے لگے تو اسیر فضا حیران...... درندے پریشان ...... لیکن چند سے کیا ہوتا، وہ شکار بننے والے غافل پرندوں کو مدد کے لئے پکارتے رہے، اتحاد کی صدائیں دیتے رہے لیکن سب فضول ......آپسی پھوٹ کی وجہ سے سب بزدل نکلے......موت سے خوف زدہ، خودداری سے محروم......!

یہ شاہین فطرت پرندے ایک درخشان تہذیب کی نمائندہ علامت تھے۔ وہ

تہذیب جس سے جدید دنیا کے سوتے پھوٹتے تھے۔ وہ اسی پرامن، خوشحال اور پائیدار تہذیب کے پروردہ شاہین تھے۔ ان کے چمن میں ہر طرف خوشحالی کا دور دورا تھا۔ چمن کی فضا امن وسکون کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ باغی پرندوں کے گلستان کی یہ معطر ہوائیں، ان بدمست درندوں کو دیوانہ کر بیٹھیں۔ انھوں نے اپنی عفونت زدہ سانسوں کو ان خوشبو دار فضاؤں میں تحلیل کرنا شروع کر دیا اور اپنی بدصورت جونچوں سے آزاد چمن کے نرم ونازک پھولوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ چمن کے شاہین اپنے پُر امن چمن کو ان درندہ صفت کرگسوں کی تباہی سے بچانے کی خاطر مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوگئے کافی عرصہ تک وہ پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ دو لومڑیوں نے بھی ایک خونخوار شیر کو مار گرایا تھا، یہاں تو جدید دور کے طاقت ور درندوں کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا۔ انجام تو سب کو معلوم تھا، وہ بھی بے خبر نہیں تھے لیکن وہ خوددار تھے، باغیرت تھے، ان کی خودداری اور غیرت مندی نے انھیں جھکنے نہیں دیا۔ انھوں نے پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے ان درندوں کے سازشی آشیانوں کو بھی تباہ کر ڈالا، لیکن اس سب کے باوجود وہ فتح مندی کا سورج نہیں دیکھ سکے۔ ان کی نسل نے جب انھیں تنہا چھوڑ دیا تو وہ اپنے محفوظ ٹھکانوں میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہو گئے۔ ان کی غافل نسل دور سے کھیل کا نظارہ کرتے ہوئے لطف اندوز ہو رہی تھی، نتیجہ...... ان کے آزاد چمن امن کے دعویداروں کے غلام بن گئے۔

غلاموں کی لگام کسنے کا کام بڑے درندے نے اپنے ہاتھ میں لے لیا وہ ابھی بے قرار تھا۔ اُس کا سکون جنون میں تبدیل ہو رہا تھا کیونکہ باغی پرندوں کا سردار شاہین، اُس کی پکڑ سے باہر تھا اور اسے سزا نہ دینا اُس کے مغرور دماغ پر کوڑے برسنے کے مترادف تھا۔ تلاش جاری رہی۔ چمنستان کی اینٹ سے اینٹ بجائی گئیں۔ کئی باغی

پرندے شکار ہوئے اور کئی شکاری کے زہریلے پھندے میں پھنس گئے۔ انھیں درندے کی عدالتی پنجروں میں لایا گیا اور انھیں اپنے مقاصد کو بیان کرنے کا حکم ہوا۔ وہ شاہین فطرت پرندے موت کے پنجروں میں پھڑ پھڑانے لگے کہ

"ہم آزاد چمن کے اسیر پرندے ہیں۔ ہم اپنے چمن کو آزاد دیکھنا پسند کرتے ہیں...... ہمیں غلامی سے سخت نفرت ہیں...... ہم ہر کسی کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں...... ہم غلامی کی ذلت آمیز زندگی پر آزادی کی باعزت موت کو ترجیح دیتے ہیں......"

مغرور درندے، شاہینوں کے عزائم دیکھ کر غُرائے:

"آزادی دینا اور چھیننا ہمارا حق ہے کیونکہ ہم آزاد ہیں...... طاقت ور ہیں...... امن کے پیامبر ہیں...... جمہوریت کے علمبردار ہیں...... تم غلاموں کی یہ ہمت کہ تم ہمارے خلاف بغاوت پر اتر آئے...... تمہاری نسل کی سانسیں ہمارے رحم وکرم پر چل رہی ہیں۔"

باغی شاہینوں کو جب موت کی سزا سنائی گئی تو بھی وہ آزادی آزادی پکارتے رہے۔ ان کی گردن میں جب پھانسی کا پھندا ڈالا گیا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے شبنمی قطرے چمک رہے تھے۔ درندوں کا سردار خوشی سے چہک رہا تھا۔ وہ اپنی تہذیب کے گن گا رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آج وہ اس نسل سے صدیوں کا بدلہ لے رہا ہے لیکن وہ پھر بھی کبھی کبھی مایوس ہو رہا تھا کیونکہ ان باغی پرندوں کا سردار ابھی ان کے ہاتھ نہیں لگا تھا باغی پرندوں کی نسل کے کچھ پرندے خاموش احتجاج کرتے رہے، انھوں نے غلامی کی ذلت دیکھی تھی وہ احتجاج کے بغیر کرتے بھی کیا کیونکہ غلام کے پاس احتجاج کے بغیر ہوتا ہی کیا ہے۔

زمانہ گردش کرتا رہا...... برسوں گزر گئے ...... وقت کا مزاج بدلتا رہا......

درندوں میں پھوٹ پڑگئی کیونکہ بڑا درندہ دوسرے درندوں پر اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے......سارا جنگل آگ برسانے لگا......تمام خون خوار درندوں کے ٹھکانے اس آگ کی لپیٹ میں آگے...... ہر طرف بربادی اور تباہی پھیل چکی تھی کیونکہ دنیا میں تیسری جنگ عظیم کا سائرن بج چکا تھا۔



ہوم لینڈ

وہ جنت نما وادی تھی، اس کے پاسبان برف سے ڈھکے ہوئے...... آسمان کے حریف بلند و بالا خاموش پہاڑ تھے۔ بہار کے موسم میں جب سورج کی کرنیں ان برفیلے پہاڑوں پر پڑتی تھیں تو برف پگھل کر ٹھنڈے پانی میں تبدیل ہوکر بلندی سے پستی کی طرف مدھم آواز میں دھیرے دھیرے سفر شروع کرتی تھی اور اس گلپوش وادی کے چمن زاروں کے رنگ برنگے پھولوں کے لئے آب حیات کا کام انجام دیتی۔ یہ وادی ایک منفرد تہذیب و ثقافت کا مسکن رہی تھی جو صدیوں کی تاریخ پر مشتمل تھا۔ لوگ مختلف مذاہب کے پیروکار تھے لیکن انسانیت نوازی سب کا مشترکہ مذہب تھا۔ عبداللہ خان، سوم ناتھ اور سردار سرجیت سنگھ، ہندو، مسلم اور سکھ اتحاد کی پائیدار علامت تھے۔ ان لوگوں نے زندگی کی ستر بہاریں دیکھی تھیں۔ یہ ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے اور زمانے کے نشیب و فراز میں بھی یہ لوگ اتحاد و اتفاق کی بے مثل علامت تھے۔ الگ الگ مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ لوگ ایک ہی کنویں سے پانی پیتے تھے اور ایک ہی کھیوٹ سے فصل اُگاتے تھے۔ گاؤں میں ایک بہت بڑا صدیوں پرانا چنار تھا۔ یہ تینوں اس

چنار کے سائے میں غم روزگار پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ یہ چنار اس علاقے کے لوگوں کا صدیوں پرانا ورثہ تھا اور امن کی علامت بھی، کیونکہ جب بھی بستی میں بدامنی کا کوئی واقعہ پیش آتا تھا تو بستی کے لوگ مل جل کر اس چنار کے سائے میں بیٹھ کر بدامنی کو امن میں تبدیل کرتے تھے۔

عبداللہ، سوم ناتھ اور سردار سرجیت سنگھ بچپن کے ساتھی تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے حد محبت کرتے تھے، محبت کی یہ روایت بزرگوں کا ورثہ تھا۔ گاؤں میں جب بھی کوئی مذہبی تہوار ہوتا تھا تو مشکل سے ہی پہچان ہوتی کہ یہ کس مذہب کا تہوار ہے کیونکہ سب لوگ ہر تہوار مشترکہ طور پر مناتے تھے اور آپسی بھائی چارے کا یہ عالم تھا کہ جب سوم ناتھ کی شادی رچائی گئی تھی تو سوم ناتھ کے ساتھ عبداللہ خان اور سردار سرجیت سنگھ ہی اس کے سسرال گئے تھے اور دلہن کو سجا کر ڈولی میں لائے تھے۔

ایک دن ...... گھنے چنار کے سائے ...... سوم ناتھ نے بھائی چارے کی اس مضبوط روایت کو یہ کہہ کر توڑ ڈالا کہ ''وہ یہ وادی چھوڑ رہا ہے''۔ عبداللہ خان اور سرجیت سنگھ یہ خلاف توقع والی بات سن کر دم بخود ہو گئے، انھیں محسوس ہوا کہ اس بڑے چنار کی ایک پرانی شاخ کو خزاں کے سایوں نے اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا ہے۔ عبداللہ خان نے غصے میں آ کر سوم ناتھ سے پوچھا!

''سوم ناتھ! آپ کیوں اس صدیوں کے بھائی چارے کو توڑنا چاہتے ہو؟ تم ہمیں چھوڑ کر مت جا۔''

''نہیں عبداللہ بھائی''، سوم ناتھ نے درد بھری آواز میں کہا ''ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنوں سے سندیش ملا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے تم وادی چھوڑ کے چلے آؤ۔ میرا دل بھی اس جنم بھومی کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے لیکن جب برادری کے

دوسرے لوگ بھاگ رہے ہیں تو میں یہاں اکیلا کیا کروں گا۔"
سوم ناتھ کی یہ باتیں سن کر سردار سرجیت سنگھ آگ بگولہ ہو گیا اور تلوار ہوا میں لہراتے ہوئے بول پڑا!

"سومے! ہم لوگ صدیوں سے اکٹھا رہتے آئے ہیں۔ ہمارے بزرگ بھی ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، کس کی مجال ہے جو ہم کو جدا کرے اور ہمیں اپنے گھروں سے بے گھر کردے۔ مجھے بھی اپنوں سے پیغام آیا تھا لیکن میں نے جانے سے انکار کردیا۔ ہم تینوں آنے والے طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔"

سوم ناتھ خیالات کے سمندر میں کھو گیا۔ اس کو سکھ دکھ کے وہ دن یاد آ گئے جوان تینوں نے ایک ساتھ گزارے تھے۔ اسے برسوں پہلے کا وہ واقعہ بھی یاد آیا جب قبائلوں نے وادی پر حملہ کردیا تھا اور عبداللہ خان نے اس کے خاندان کو ایک مہینے تک اپنے گھر میں رکھا تھا تا کہ ان پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ سوم ناتھ نے عبداللہ خان کے چہرے کی طرف جب دیکھا تو اُسے عبداللہ خان کا وہ احسان بھی یاد آیا جب اسپتال میں اس کے بیٹے کو بچانے کے لئے عبداللہ خان نے اپنا خون پیش کیا تھا۔ شام ڈھلتے ہی تینوں دوست اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ چلے۔

صبح سویرے عبداللہ خان چنار کے سایہ تلے ان دونوں ہم وطنوں کا انتظار کرتا رہا۔ کافی دیر کے بعد سردار سرجیت سنگھ نمودار ہوا۔ سردار نے جب سوم ناتھ کو وہاں نہیں پایا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔ دونوں سوم ناتھ کے گھر کی طرف چلے گئے، وہاں ہر طرف خاموش تھی، گھر کے دروازے پر تالا چڑھا ہوا تھا۔ سوم ناتھ رات کے اندھیرے میں بھائی چارے کی صدیوں پرانی زنجیر کو کاٹ کر پہاڑی کی دوسری جانب فرار ہو کر اپنوں کے پاس چلا گیا تھا۔ لیکن وہ یہ سچائی بھول بیٹھا تھا کہ پیڑ

جب اپنی زمین سے اکھڑ جاتا ہے تو پرائی زمین اُس کی جڑوں کو پھلنے پھولنے نہیں دیتی ہیں۔سوم ناتھ کی گائے بدحواسی کے عالم میں صحن کے اندر چکر کاٹ رہی تھی۔عبداللہ خان،سوم ناتھ کی گائے کوامانت سمجھ کر گھر لے آیا۔

وقت گزرتا رہا،دن مہینے اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔وادی میں ہرطرف خوف ودہشت کا ماحول چھایا ہوا تھا۔وطن کی آن بچانے کی خاطر سینکڑوں لوگوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ہزاروں گھر جلائے گئے،راتیں موت کا منظر پیش کرتی رہیں اور دن میدان جنگ کا سماں! گھر سے نکلنے کے بعد کسی کو یہ امید نہیں ہوتی تھی کہ وہ دوبارہ گھر زندہ آئے گا یانہیں؟ اس سب کے باوجود عبداللہ خان اور سردار سرجیت سنگھ کا بھائی چارہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

چند برسوں کے بعد عبداللہ خان کے نام سوم ناتھ کی ایک چھٹی آئی۔عبداللہ خان چھٹی لے کر سردار سرجیت سنگھ کے گھر چلا گیا۔سردار چھٹی کھول کر پڑھنے لگا۔سوم ناتھ نے عبداللہ خان کولکھا تھا:

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی جو میں نے دوسروں کے بہکاوے میں آکر اپنے آپ کو مصیبت کے بھنور میں جھونک دیا۔وہاں آپ لوگ ہماری بہو بیٹیوں کی عزت بھی کرتے تھے اور حفاظت بھی! لیکن یہاں جنہیں ہم اپنا سمجھتے رہے وہ ہماری بہو بیٹیوں کی طرف ہوس بھری نظروں سے دیکھتے ہیں اور ہمیں مائیگرینٹ کہہ کر ہر مقام پر ذلیل کرتے رہتے ہیں۔"

عبداللہ خان اور سرجیت سنگھ خط پڑھتے پڑھتے بڑی دیر تک روتے رہے۔سوم ناتھ نے عبداللہ خان کو مزید لکھا تھا:

"عبداللہ اگر آپ مجھ پر رحم کرو گے تو میرا آبائی مکان جلا ڈالو تا کہ میں سرکار سے

معاوضہ لے سکوں اور انشورنس کمپنی سے پیسے وصول کرسکوں اور میری زمین بھی بیچ ڈالو کیونکہ میرے بیٹے پرتھوی کو آرمی میں آفیسر کا عہدہ مل گیا ہے اس لئے اب اسے ٹریننگ پر جانا ہے جس کے لئے مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے، آپ کا مجھ پر اور میرے بیٹے پر بڑا احسان رہے گا۔ اگر آپ میرا یہ کام کرو گے۔"

عبداللہ خان نے گھر آکر اپنے بیٹے غزنوی سے مشورہ کیا کہ "سوم ناتھ کا مکان، ان کی امانت ہے، اسے ہم کیسے جلا سکتے ہیں، وہ اگر واپس آئیں تو کہاں رہیں گے۔ اس کے بدلے میرے پاس کچھ پیسے ہیں اور سوم ناتھ کی آدھی زمین ہم بیچ ڈالیں گے۔" چند دنوں کے اندر عبداللہ خان نے سوم ناتھ کو پیسے بھیج دیئے۔ ایک مہینے کے بعد سوم ناتھ کا ایک پارسل عبداللہ خان کو پہنچ گیا، جس میں زمین کے کاغذات کے علاوہ ایک چھٹی بھی تھی جس میں سوم ناتھ نے لکھا تھا کہ "ہم لوگ آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔ پرتھوی نے نوکری جوائن کرلی، یہ سب آپ کی مخلصانہ مدد سے ہوا۔"

ایک رات سوم ناتھ کے گھر سے اچانک آگ نمودار ہوئی۔ تمام گاؤں والے آگ بجھانے کے لئے دوڑ پڑے لیکن آگ پر قابو نہ پا سکے۔ کچھ مہینوں کے بعد سردار سرجیت سنگھ کو سوم ناتھ کا ایک خط موصول ہوا، جس میں لکھا تھا کہ میں نے مکان کا انشورنس کمپنی سے حاصل کرلیا ہے اور سرکار کی طرف سے معاوضہ بھی ملا ہے۔ اب تم مکان والی زمین خریدلو، کاغذات میں چند دنوں کے اندر بھیج دوں گا۔ سرجیت سنگھ نے زمین خرید کر اس پر ایک عالیشان مکان تعمیر کروایا اور کچھ ہی برسوں میں سوم ناتھ کی زمین پر ایک قصبہ نما گاؤں تعمیر ہوا۔

تقریباً بیس برس گزر گئے۔ وادی کے حالات اب کچھ حد تک سدھر گئے تھے۔ ایک روز لوگ جب صبح سویرے نیند سے جاگے تو سارے علاقے کو فوج نے اپنے

گھیرے میں لیا تھا۔ دوپہر کے وقت کریک ڈاون کا اعلان ہوا اور تمام لوگوں کو اپنے اپنے گھروں سے بھیڑ بکریوں کی طرح نکالا گیا اور ایک کھلے میدان میں جمع کیا گیا۔ فوج کا افسر جب بڑے رعب داب کے ساتھ لوگوں کے سامنے کھڑا ہو گیا تو لوگ خوش بھی ہوئے اور حیران بھی۔ یہ افسر سوم ناتھ کالڑ کا پرتھوی تھا۔ پرتھوی مائک ہاتھ میں اٹھائے لوگوں سے مخاطب ہوا:

"ہم لوگ پچھلے بیس برسوں سے جن بدترین حالات کا شکار ہوتے آئے ہیں، اس کے ذمہ دار تم لوگ ہو۔ تم ہی لوگوں نے ہمیں اپنے گھروں سے بے گھر کر دیا۔ ہمارے مکان جلائے، ہماری زمینوں پر ناجائز قبضہ کر ڈالا۔ اب ہم واپس آنا چاہتے ہیں۔ ہم تم لوگوں کو ایک مہینے کی مہلت دیتے ہیں، تم لوگ ہماری زمینوں کو چھوڑ دو...... یہاں پر ہمارا ہوم لینڈ بنے گا۔"

لوگ پرتھوی کی دل آزار باتوں سے برہم ہو گئے۔ عبداللہ خان لاٹھی کے سہارے پرتھوی کی طرف بڑھ گیا اور اُسے سمجھانے لگا کہ "بیٹا تم لوگ ضرور واپس آؤ لیکن ہم پر غلط الزامات مت لگاؤ۔" یہ سنتے ہی پرتھوی نے اپنے گن سے عبداللہ خان کے دو دانت توڑ دیئے۔ لوگ پرتھوی کی وحشیانہ حرکت دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے۔ ہر طرف شور مچا، ظلم کے خلاف نعرے بلند ہو گئے، بھیڑ میں عبداللہ خان کا لڑکا غزنوی کھڑا ہو گیا، وہ پرتھوی سے جارحانہ لہجے میں کہنے لگا:

"تم لوگ اپنی جنم بھومی کو دھوکہ دے کر اور صدیوں کے بھائی چارے کو توڑ کر یہاں سے فرار ہوئے ہو، تم لوگوں نے خود اپنے مکان جلوائے اور اپنی زمین ہمیں بیچ ڈالیں تم لوگوں نے اس پوتر دھرتی کو تیاگ دیا، اب ہم لوگوں کے راستے الگ ہو چکے ہیں۔"

یہ سنتے ہی فوجی لوگوں پر ٹوٹ پڑے، سینکڑوں لوگ زخمی ہو گئے۔ پرتھوی لوگوں کو ایک مہینے کی مہلت دے کر وہاں سے چل دیا۔

ایک مہینے کے بعد پرتھوی جب اس علاقے میں دوبارہ آ گیا تو وہاں کا ماحول بدل چکا تھا۔ بستی کے چوراہے پر ایک بڑا بورڈ لگایا گیا تھا جس پر سبز حروف سے آزاد لینڈ لکھا ہوا تھا اور علاقے کے نوجوان اپنے ہاتھوں میں ہتھیار تھامے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ حالات......!

جھانک کر مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر دیکھ
(اقبال)

.................☆☆☆.................

کشمیر نواز

زمین حُسن خیز کی پر سکون و جان بخش فضائیں ...... قرنوں سے...... کالے دیوؤں کے آسیب سے سحر زدہ ہو رہی تھیں۔ یہ آفت زدہ وادی...... کشمیر نواز کے سنہرے خوابوں کی حسین تعبیر تھی اور اُس کی ستم زدہ نسل، ایک مدت سے، کالے دیوؤں کے حکم جابری کی تابعداری کرتے ہوئے، جھیل ولر کی منجمد سطح کے اوپر ننگے بدن ننگے آسمان تلے سرما کی جان لیوا سردی میں برف کے بُت بنی ہوئی تھی۔ سرما کی برف باری کی وجہ سے جھیل ولر کا پانی جم گیا تھا اور اس ٹھٹھرتی سردی میں کالے دیو، وادی کے باشندوں کو اپنے عذاب سے تڑپا رہے تھے۔ جھیل ولر کی اس یخ بستہ سطح پر وہ لوگ برفیلے پیڑ جیسے لگ رہے تھے۔ کالے دیوؤں کا ڈر ان لوگوں کے دلوں میں اس طرح سے بیٹھ گیا تھا کہ ہونٹوں پر جمی ہوئی برف کو چوسنے سے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کشمیر نواز اپنی برفیلی جسم والی نردوش نسل کی بے بسی دیکھ کر اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کی اس خوب صورت پھولوں بھری وادی کے مالی کب تک برف کے یہ سفید کفن اوڑھے رہینگے۔ کون انھیں ان کالے دیوؤں کے آسیب سے نجات دلائے گا۔

اب کوئی ''کشف ریشی''، نہیں آئے گا......کوئی کشف ریشی نہیں......! کشمیرنواز کا ذہن یہ سوچتے سوچتے ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔

ماضی کے پردوں میں کشمیرنواز کو وہ دور نظر آیا جب وادی کے چاروں طرف پانی ہی پانی پھیلا ہوا تھا اور لوگ کشتیوں میں زندگی گزارتے تھے۔ لوگ زیادہ تر مچھلیوں کا شکار کرتے تھے اور آرام سے زندگی گزارتے تھے۔ اس زمانے کے کالے دیوؤں کو ان لوگوں کی خوشحالی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، اس لئے وہ آہستہ آہستہ وادی کے لوگوں کو ستانے پر اتر آئے۔ کالے دیورات کے اندھیرے میں لوگوں کے گھروں پر شب خون مارتے تھے اور ان کے معصوم بچوں کو اپنے والدین سے زبردستی چھین کر جھیل ولر کے گہرے پانی میں پھینک دیتے تھے۔ وادی کے لوگ جب ان کالے دیوؤں کے جوروستم سے تنگ آ گئے تو شب خیزی میں نکلنے والی اُن کی مظلوم آہوں کا درد اُس زمانے کے پیغمبر حضرت سلیمانؑ نے محسوس کیا، وہ ان مظلوموں کی فریادرسی کے لئے اپنے تخت پر سوار ہو کر وادی کی جانب آیا اور اپنا اُڑن کھٹولا کوہ سلیمانی پر ٹھہرایا۔ لوگ جوگ در جوگ حضرت سلیمان کے پاس اپنی فریاد لے کر پہنچے اور انھیں کالے دیوؤں کے ظلم وستم کی روداد سُنائی۔ لوگوں کی فریاد سُن کر حضرت سلیمانؑ نے تمام جنات کو حکم دیا کہ آج سے وہ کسی بھی آدم زاد کو نہیں ستائیں گے اور جو مظالم ان دیوؤں نے آج تک وادی کے لوگون پر ڈھائے تھے، سزا کے طور پر انھیں وادی میں موجود سارے پانی کو نکالنے کا حکم دے دیا گیا۔ لوگوں نے حضرت سلیمانؑ کا شکریہ ادا کیا اور اُسے اُس وقت کی زبان میں ''کشف ریشی'' کے نام سے یاد رکھا۔

کشمیرنواز کی سوچ ابھی ماضی کے واقعات میں ہی گم تھی کہ اچانک اُسے ہر طرف چیخ و پکار سنائی دی۔ اُس نے جب آنکھیں کھولی تو دیکھا کہ کالے دیو اُس کی

نوجوان نسل پر آگ کے کوڑے برسا رہے ہیں۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اگر یہ لوگ اسی طرح ظلم سہتے رہینگے تو میری یہ خوابوں کی وادی معصوم آوازوں کا مدفن بنتی جائے گی۔ وہ کوہِ سلیمانی کی جانب دوڑ پڑا، پہاڑ کے اوپر پہنچ کر وہ اُس جگہ کو کھودنے لگا جہاں پر ماضی میں حضرت سلیمانؑ کا اڑن کھٹولا ٹھرا تھا۔ زمین کھودتے ہوئے اس کے ہاتھ حضرت سلیمان کی جادوئی انگوٹھی لگ گئی۔ اس نے انگوٹھی کو کڑاہی میں پگھلایا اور سینکڑوں نئی انگوٹھیاں بناڈالی۔ وہ ان انگوٹھیوں کو پہاڑ سے نیچے پھینکتا گیا اور وادی کے ستم رسیدہ لوگوں کے حوصلوں کو بڑھاتا رہا۔ اس کی آواز ہر طرف گونج رہی تھی وہ اپنے لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ ”جاگو! ان انگوٹھیوں کو پہنو...... اپنے سرد پڑے خون میں حرارت بھردو...... آگ کے بدلے آگ بن جاؤ“ ......!!

تمام لوگوں کے منجمد جسم حرکت میں آنے لگے۔ انگوٹھیاں پہنتے ہی ان کے اندر ایک نئی حرارت پیدا ہوئی اور ان کے برفیلے کفن پگھلنا لگے۔ وہ ایک نئے جوش، ایک نئے ولولے کے ساتھ ان کالے دیوؤں پر ٹوٹ پڑے۔ انگاروں سے انگارے ٹکرانے لگے کشمیر نواز پہاڑ پر اپنی نسل کی جرأت کو داد تحسین پیش کر رہا تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ برسوں کے بعد، اس کی وادی سے جابرانہ اقتدار کا خاتمہ ہو رہا ہے اور کالے دیو پسپائی کے عالم میں خوف زدہ ہو کر پہاڑی کے غاروں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔



کبھی الوداع نا کہنا

فصل گل کی عنبریں فضاؤں میں پہلگام کے برف پوش کہساروں کی یخ بستہ سلوں کو جب سورج کی تپتی کرنیں اپنی تپش سے چیرنا شروع کر دیتی ہیں تو پہاڑوں کی فرازی سے جھر جھر کرتے ہوئے ٹھنڈے آبشار نشیب میں منتظر پیاسی سرسبز وادی کے لئے آب حیات کے مترادف ہوتے ہیں۔ اور دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے سیلانی اپنی پیاس بجھاتے وقت ان برفیلے پہاڑوں کو قدرت کے سولر ریفریجرٹر (Solar Refrigerator) کے طور پر محسوس کرتے ہیں۔ وہ دونوں...... پہلگام کے ان برفانی پہاڑیوں کے سرسبز اور شاداب دامن میں تین سال بعد جدا ہو رہے تھے ان کی بہار کے سر پر خزاں کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ ان دونوں کے جدائی کے گرم گرم آنسوؤں سے تیز دھار ندی کے بہاؤ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کالج کے لڑکے اور لڑکیاں ان مست فضاؤں میں ایسے جھوم رہے تھے کہ جیسے بہشت کی قمریاں اور آزاد چمن کے بلبل ہوں۔ ساجد اور ساجدہ ندی کے کنارے گم سُم بیٹھے آنے والے طوفان کے کرب سے لرز رہے تھے۔ ان خوش گوار نظاروں میں جہاں ہر ایک کالج اسٹوڈنٹ چہک رہا تھا وہاں ساجدہ کے ہونٹوں سے سرد آہ کے ساتھ کسی دل جلے شاعر کا یہ شعر نکل رہا تھا۔

برفیلی ہوائیں ہیں، برفیلی فضائیں ہیں
اک ہم ہیں ستم رسیدہ، اس پر یہ ادائیں ہیں

"یہ محبت ہم دونوں کی زندگی میں ایک حسین خواب کی طرح کیوں آئی"
ساجدہ نے ساجد کے کاندھے پر سر رکھ کر روتے بلکتے ہوئے مایوس لہجے میں کہا "کیوں تقدیر ہمیں زہریلی جدائی کا غم سہنے پر مجبور کر رہی ہے۔" ساجد یہ سنکر جذباتی ہو کر بول پڑا۔

"محبت ...... محبت ...... اس کی حقیقت اُسی کے ذہن میں اثر انداز ہو سکتی ہے جس کو زندگی میں اس حسین بھلا سے واسطہ پڑا ہو۔ ہمارے والدین ذہنی طور پر سماجی رسم و رواج کے اسیر ہیں۔ وہ شادی بیاہ کو ایک سماجی رسم سمجھتے ہیں نہ کہ دو دلوں کا ملن۔ وہ اپنی خاندانی روایت کو فخر کے جھوٹے پردے میں آگے بڑھاتے ہوئے ہمارے معصوم ارمانوں کا خون کر رہے ہیں۔"

تین برس ان دونوں کے لئے تین صدیوں کے مانند تھے۔ یہ دونوں کالج کے بیتے ہوئے دنوں کی رسیلی یادوں میں کھو گئے۔ ان کی پہلی ملاقات کالج کے پہلے دن کالج لائبریری میں ہوئی تھی۔ پہلے پہلے دونوں ایک دوسرے کو خاموش نگاہوں سے تکتے رہے لیکن چند مہینوں میں ان کی دوری قربت میں تبدیل ہوتی گئی اور وہ ایک دوسرے کو مخصوص انداز سے سمجھنے لگے۔ ساتھ ساتھ مطالعہ کرنے کے علاوہ یہ دونوں سیمناروں میں بھی اکٹھا حصہ لیتے تھے اور کلاسز بھی ایک ساتھ ایٹنڈ کرتے تھے۔ دو سال کے اندر وہ ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کو اچھی طرح سمجھ پائے تھے اور تیسرے سال یعنی گریجویشن کے آخری سال دونوں نے ڈگری حاصل کرنے کے بعد اپنی محبت کو شادی کے بندھن میں باندھنے کے سنہرے خواب دیکھنے شروع کئے۔

لیکن یہ خواب اسوقت سراب دکھائی دیا جب ایک دن ساجد کی ماں نے اسے کہا کہ تمہارے ابا جان نے تیری شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ سنتے ہی ساجد کا سر چکرانے لگا۔ ''مجھ سے پوچھے بغیر میری شادی کا فیصلہ'' ساجد نے جذباتی انداز میں کہا ''اور ہاں! لڑکی پڑھی لکھی ہے یا ان پڑھ......'' ''ان پڑھ ہے ان پڑھ! کچھ بھی نہیں پڑھا ہے'' ساجد کا باپ یہ کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تو ابھی کماتا نہیں ہے لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی میری ریٹائرمنٹ ہونے تک پندرہ برس کا عرصہ ہے'' باپ کے یہ فرسودہ خیالات ساجد کے سر پر ہتھوڑا مارنے کے برابر تھے۔

''ابا جان! کمانے والی بات نہیں ہے۔ میرے بھی کچھ خواب ہیں کچھ خواہشیں ہیں......شادی تو ضرور کرنی ہے لیکن میں اپنی پسند کے مطابق کسی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرونگا''۔ یہ کہتے ہوئے ساجد نے اپنا سر جھکالیا۔

''تمہارے خواب......تمہاری خواہشیں......ہمیں ان سے کچھ لینا دینا نہیں''۔ ساجد کے باپ نے دھمکی بھرے انداز میں کہا ''میں نے تمہارا رشتہ اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں طے کرلیا ہے۔ اگر تم نے انکار کردیا تو سماج میں میری کیا عزت رہے گی''۔

''ابا جان! شادی کا معاملہ زندگی سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ آنے والی نسل کا مسئلہ ہوتا ہے۔'' ساجد گھر والوں کو سمجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ چند دنوں کے بعد ساجد کے باپ نے اپنی جھوٹی انا کی خاطر ساجد کے جذبات اور خواہشات کا سودا کر کے شادی کی تاریخ مقرر کرڈالی۔

اُس دن ساجد پہلگام کی حسین وادی میں ندی کنارے ساجدہ کو اپنی محبت کا بے رحم انجام سناتے سناتے جدائی کے درد سے اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا۔ بے خودی کے

عالم میں دونوں ندی کے اوپر والے پل کے درمیان چلتے چلتے پہنچ گئے۔ انھیں محسوس ہونے لگا کہ جیسے پہلگام کی برفیلی پہاڑیوں سے آگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور برف پگھلنے سے ندی میں طغیانی آئی جس کی وجہ سے پل بیچ میں ٹوٹ گیا اور یہ دونوں ندی کے بہتے ہوئے پانی میں ڈوب گئے اور تیز دھار طوفان نے دونوں کو الگ الگ کناروں پر پھینک دیا۔

ساجد کی شادی کے بعد ساجدہ کی شادی بھی دوسرے شہر میں کردی گی۔ دس سال بعد ساجد نے پی ایچ ڈی مکمل کرلیا اور اسی کالج میں بحثییت لیکچرر تعینات ہوا جہاں سے اُس نے گریجویشن کی تھی۔ جوائن کرنے کے لئے جب وہ کالج کے آفس میں پہنچا تو وہ ساجدہ کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ساجدہ بھی آج ہی جوائن کر چکی تھی۔ جوئینگ رپورٹ ڈالنے کے بعد وہ دونوں اسی پیڑ کے نیچے کرسیاں لگا کر بیٹھ گئے جہاں گریجویشن کے دنوں وہ سبزے پر بیٹھ کر فرصت کے لمحات میں اپنے حسین مستقبل کے خوابوں کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ ''ساجد کیسے ہو؟'' ساجدہ نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا ''ان برسوں میں مجھ سے کبھی بھی ملنے کی کوشش نہیں کی۔''

''کس لئے ملنے کی کوشش کرتا'' ساجد نے سرد لہجے میں جواب دیا ''ہمیشہ اپنے مقدر پر رونا آتا ہے......تم اپنی سناؤ۔ کتنے بچے ہیں۔''

''ساجد ان دس برسوں میں بہت کچھ بدلا۔'' ساجدہ یہ کہتی ہوئی رو پڑی ''جس کے ساتھ میری شادی ہوئی تھی وہ بزنس...... کرتا تھا اور مجھے اعلیٰ تعلیم کا شوق تھا جس کے لئے وہ تیار نہیں تھا گھر میں ہمیشہ لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے اور قسمت نے چند ہی مہینوں میں ہم دونوں کو جُدا کر دیا۔ اب صرف تنہائی اور میں......!''

کالج کے اسٹوڈنٹس نے دوسرے دن پہلگام جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

اسٹاف کی طرف سے ساجد اور ساجدہ کو اسٹوڈنٹس کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ دونوں پہلگام پہنچ کر دس برس پہلی والی جگہ ندی کے کنارے بیٹھ گئے۔ فضا خوشگوار تھی، پھول مہک رہے تھے اور تتلیاں ان کے اردگرد چکر لگا رہی تھیں۔ ندی کا پل آج بھی ٹوٹا پڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ٹوٹے ہوئے پل پر مرکوز تھیں، پل شاید سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کی جدائی کی وجہ سے وہ ٹوٹ گیا تھا اور دس سال تک وہ اس لئے انتظار کرتا رہا کہ یہ دونوں اس کی دوبارہ تعمیر کا باعث بنیں گے۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پل کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ پہلگام کی سرسبز وشاداب وادی میں پھر سے بہار اپنا جلوا دکھانے لگی۔ اور ہواؤں نے گلاب کے پھولوں سے ان دونوں کا سواگت کیا جس کے لئے وہ برسوں سے انتظار میں تھے۔ ریڈیو سے غزل چل رہی تھی۔

مرے تخیل کی تنگ دنیا تیرے تصور سے ہے فروزاں
تجھے گماں ہے کہ میں ابھی تک تیری تمنا میں جی رہا ہوں



اپنا سورج

بادصرصر اچانک نمودار ہو جاتی تھی اور مہکتے چمن کے پھولوں کی سرخ گلابی پتیوں کو ریزہ ریزہ کر کے گردوغبار میں بکھیر دیتی تھی۔ بادصرصر کی اس طوفانی آمد سے ڈر کر جب چھوٹے چھوٹے بچے اپنے بزرگوں سے پوچھتے تھے کہ یہ تیز و تند ہوا گلابی موسم میں نمودار ہو کر ہمارے چمن کے خوبصورت پھولوں کو کیوں بھری جوانی میں فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے تو بزرگ لوگ اپنے بچوں کی سوچ کے مطابق جواب دیتے تھے کہ ہماری وادی کا سورج اونچے اونچے پہاڑوں کے پیچھے پھیلی ہوئی ایک گہری کالی جھیل کے یخ بستہ دبیز تہوں میں پھنسا ہوا ہے اور شیش ناگ اپنے زہریلے پھنوں سے اُس کی چمکتی کرنوں کو دھویں میں تبدیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے چمن تک اتنی ہی سورج کی دھوپ پہنچتی ہے جتنا شیش ناگ چاہتا ہے اسی لئے جب بھی بادصرصر چاہتی ہے تو ہمارے چمن کی طرف رخ کرتی ہے اور یہاں تباہی مچاتی ہے۔

وہ جب کچی عمر کا تھا تو بادصرصر کی طوفانی آمد کے ساتھ ہی اُس کا دھیان بزرگوں کی سنائی ہوئی طلسماتی کہانی کی طرف فوراً چلا جاتا تھا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ

ساتھ اس کی عقل میں بھی پختگی آنے لگی۔ وہ ہسٹری پڑھنے کا بڑا شوقین تھا کیونکہ بچپن سے اُس کے کان طلسماتی قصہ کہانیاں سنتے آئے تھے۔ ہسٹری پڑھنے کے ساتھ ساتھ اُس کا ذہن جغرافیہ کی طرف بھی مائل ہوتا گیا وہ ہسٹری اور جغرافیہ میں کالی جھیل اور شیش ناگ کی حقیقت ڈھونڈتا رہا لیکن اُسے نہ کسی ہسٹری میں کسی خیالی جھیل کا ذکر ملتا تھا اور نہ کسی جغرافیہ میں کسی شیش ناگ کا کوئی روپ نظر آتا تھا۔ وہ آزاد سوچ کا مالک تھا اور حقیقت پسند بھی۔ وہ سوچتا رہتا کہ جب سورج کے دھکتے شعلوں کو کوئی بھی جھیل سرد نہیں کرسکتی ہے اور نہ کسی شیش ناگ کے پھن اس کی چمکتی کرنوں کو کالا بنا سکتی ہے تو ہماری وادی کے موسم ہی کیوں یک رنگی کے شکار نظر آرہے ہیں۔ سورج تو روز آزادی کے ساتھ نیلے آسمان کے پردے پر ڈوبتا ابھرتا رہتا ہے اور دھرتی کے ذرے ذرے کو اپنی کرنوں سے چمکاتا رہتا ہے۔

وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا کئی دہائیوں تک سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے وہ اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھتا گیا۔ پہاڑوں پر چڑھ کر وہ اپنے سورج کو ڈھونڈنے لگا۔ اُس کی نظریں کالی جھیل کے گہرے پانی پر پڑیں۔ جہاں پر اُس کا سورج جھیل کی دبیز تہوں میں مایوس چھپا ہوا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے سورج کو اس جھیل کی جابرانہ تہوں سے آزاد کرے گا۔ اُس کی سوچ کے ساتھ دوسرے لوگوں کی سوچیں بھی شامل ہوگئیں اور یہ سوچیں فضائے بسیط میں پرواز کرنا لگیں۔ ان کی سوچیں ایک ساتھ اپنے ناخنوں سے جھیل کی دبیز تہوں کو کریدنے لگ گئیں۔ ان کی حِس ان سے کہہ رہی تھی کہ سخت سے سخت باد مخالف بھی متحدہ سوچ کی طاقت کو منتشر نہیں کرسکتی ہے۔

وہ لوگ اپنے پھنسے ہوئے سورج کو آزاد کرانے کے لئے اپنی متحدہ سوچ کے

نوکیلے ناخنوں سے طلسماتی جھیل کے یخ بستہ تہوں کو کرید نے کی کوشش کرنے لگے اور کئی تہوں کو کرید کر جب شیش ناگ کی کینچلی پر نوکیلے ناخنوں کی ضربیں پڑھنے لگیں تو شیش ناگ کے زہریلے پھنوں نے بادصرصر کا روپ دھار کران کے خوبصورت چمن پر حملہ کر دیا۔ بادصرصر کا زور اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ نہ صرف چمن کے رنگ برنگے پھول تباہ ہونے لگے بلکہ چمن کے پودے بھی جڑ سے اکھڑنے لگے۔ یہ خوفناک صورت حال دیکھ کران لوگوں کی ہمت ٹوٹنے لگی لیکن ان کے بزرگوں نے یہ کہہ کران کی ہمت بڑھائی کہ یہ بادصرصر برسوں سے ہمارے چمن زاروں کو برباد کرتے آئی ہے اگر آج آپ لوگوں نے اپنے سورج کو کالی جھیل کی دبیز تہوں کی غلامی سے آزاد نہیں کرایا تو ہمارا یہ چمن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بادصرصر کے نشانے پر رہے گا اور کسی بھی پھول کو بھرپور کھلنے کا موقع نہیں ملے گا۔

بزرگوں کی حوصلہ افزا نصیحت سن کران لوگوں کی ہمت اور بڑھ گئی اور وہ لگا تار جھیل کی دبیز تہوں کو پھاڑنے لگ گئے۔ جھیل کا کالا پانی جب ندیوں کی صورت میں سفر کرنے لگا تو شیش ناگ کو اپنا زہریلا وجود خطرے میں نظر آنے لگا۔ وہ ان لوگوں کی متحدہ سوچوں کو ڈسنے پر اتر آیا۔ اُس نے کئی جوانوں کو جھیل کی گہرائی میں ڈبو کر مار ڈالا لیکن وہ لوگ اپنے سورج کی آزادی کے لئے کوشش کرتے رہے۔ بزرگوں نے بہت سارے بچوں کو شیش ناگ کے زہریلے پھنوں کا شکار ہوتے دیکھا تو انھوں نے بین بجانے شروع کردے۔ بین کی آواز ہر طرف گونجنے لگیں اور شیش ناگ بین کی آواز پر مستی سے جھومنے لگا۔ شیش ناگ کو جھومتا دیکھ کر بزرگوں نے بہادر جوانوں کو حکم دیا کہ شیش ناگ کی کینچلی اکھیڑ دو۔ ان لوگوں نے شیش ناگ کی کینچلی اکھیڑنے کے ساتھ ساتھ اُس کے زہریلے دانتوں کو بھی توڑنا شروع کر دیا۔ جھیل کا کالا پانی آہستہ آہستہ کم ہوتا

گیا اور ان کا اپنا سورج آہستہ آہستہ جھیل کی قید سے آزاد ہوکر اوپر چڑھتا گیا۔ جھیل کو خشک ہوتے دیکھ کر شیش ناگ زخمی حالت میں وہاں سے فرار ہوا اور ان کے چمن میں بادِ صرصر کی بجائے بادِ صبا پھیلنے لگی۔ سورج کی کرنیں آزادی کے ساتھ ان کے چمن کے پھولوں کی پتیوں پر جمے ہوئے شبنمی قطروں کو چمکانے لگیں۔ بادِ صبا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے سارے پھول نکھرنے لگے اور سارا چمن خوشی سے جھومنے لگا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ چمن کے رنگ برنگے پھول اپنی نئی ہسٹری رقم کر رہے ہیں جس میں نہ کسی کالی جھیل کا فسانہ تھا اور نہ کسی شیش ناگ کا قصہ......"

....................................

مسائل کے یزید

اُس نے پھر اپنے موجود ہونے کا احساس دلایا۔ کلاشنکوف کا گھوڑا دبا کر آن کی آن میں اپنے شکار کو ڈھیر کر ڈالا اور جلسے میں بھگدڑ کے دوران نہ جانے وہ بھی کہاں غائب ہو گیا۔ وہ کئی برسوں سے کسی بھی سیاسی جلسے میں اچانک نمودار ہوتا تھا اور کسی خوفناک بھوکے شیر کی طرح چند ہی لمحوں میں اپنے شکار کا صفایا کر کے غائب ہو جاتا تھا قانون کے محافظ کئی دنوں تک اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے لیکن اپنی تمام تر کوشش کے باوجود جب وہ ناکام رہتے تو تھک ہار کر وہ دوسرے معاملات کو نپٹانے میں لگ جاتے ۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے۔ کہاں سے آتا ہے۔ اکیلا ہے یا دوسرے لوگ بھی اُس کے ساتھ ملے ہوے ہیں۔ اُس کو بھی روپوشی کا عالم پسند تھا۔ وہ جب بھی اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتا تھا تو اُسے ایک مخصوص تسکین محسوس ہوتی تھی۔ وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتا تھا کہ عام لوگ اُس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ جمہوریت میں عام لوگوں کی سوچ کو صرف استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے لوگوں کا سوچنا یا نہ سوچنا ایک ہی معنی رکھتا ہے کیونکہ انھیں تو اپنے پیٹ کا غلام بنا کے رکھ دیا جاتا ہے، وہ کب آزادی کے ساتھ اپنے دماغی سوچ کو استعمال کر سکتے

ہیں۔ کبھی کبھی وہ محسوس کرتا تھا کہ عام لوگ شاید اُس کے مشن سے اتفاق کرتے ہیں اور چند افراد اس کی حرکت کو ناپسند بھی کرتے ہیں۔ اتفاق کرنے والے لوگ اس کے مشن کو صحیح قرار دیتے رہتے کیونکہ ان کی نظر میں وہ انصاف کی لڑائی لڑ رہا ہے اور آج تک اُس کے ہاتھوں کسی بھی بے گناہ انسان کا قتل نہیں ہوا تھا۔ لیکن چند لوگ اس کے برعکس رائے رکھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک سماج دشمن عنصر ہے وہ اگر سمجھتا ہے کہ وہ اچھا کام کر رہا ہے تو اُسے قانون کا سہارا لینا چاہیے وہ سب لوگوں کی باتیں سنتا تھا اور خوشی اور ناراضگی کے بغیر صرف سوچتا رہتا...... اپنے مشن کو مکمل کرنے کے بارے میں......"

کیا وہ فطرتاً باغی تھا...... انسان کی سوچ کو بنانے یا بگاڑنے میں سماج کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اگر سماج صالح قدروں کا پاسدار ہوگا تو اس ماحول کے پروردہ ذہن بھی تعمیری سوچ کے مالک ہونگے، برعکس اس کے اگر زمین کی چھاتی پر سرسبز اور شاداب پھل دار پودوں کے بدلے نوکدار جھاڑیاں لگادی جائیں تو انسان کو زخمی ہونا ہی پڑے گا۔ وہ ایک سلیم الفطرت انسان تھا لیکن ماحول نے اس کو باغی فطرت بنا دیا۔ بچپن میں وہ ایک سرکاری اسکول میں پڑھتا تھا اور اپنی قابلیت کے بل پر ہمیشہ ٹاپ کرتا تھا لیکن اُس کے اُستاد ہمیشہ اول نمبر پر آنے کا سرکاری وظیفہ اپنے بچوں میں بانٹ دیتے تھے۔ وہ اپنا حق دوسروں کے پاس جاتے ہوئے مایوس تو ہوتا تھا لیکن وہ بڑی ہنرمندی کے ساتھ ان بچوں سے اپنا حق واپس چھین لیتا تھا۔ اس کے استاد جب وہ چند سکے اپنے بچوں کو دیتے تھے تو وہ اُن کو گوٹیاں کھیلنے پر اکساتا تھا۔ وہ گوٹیاں کھیلنے میں ماہر تھا اور چند دنوں کے اندر اندر گوٹیاں کھیلتے کھیلتے وہ تمام بچوں سے ایک ایک کر کے اپنا حق واپس لیتا تھا۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ تعلیم میں بھی آگے بڑھتا گیا لیکن وظیفہ چھیننے کا وہ عمل اُسے زندگی کے ہر موڑ پر حق تلفی اور ناانصافی کی صورت میں دکھائی دیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل

کرنے کے بعد اُسے یقین تھا کہ وہ اپنی محنت اور قابلیت کے بل پر لیکچرر بن جائے گا ۔کئی انٹرویوز دینے کے بعد بھی اُس کا خواب پورا نہ ہوسکا۔کوئی بھی سلیکشن لسٹ بغیر سیاسی مداخلت کے نہیں بنتا تھا۔اُس کی کمند اتنی لمبی نہیں تھی کہ وہ سیاسی ایوانوں کے اونچے کنگروں تک پہنچ پاتی۔

اُس کی عمراب اوراتیج کی طرف بڑھ رہی تھی اوراس کی مایوسی میں اضافہ ہورہا تھا۔اس کے یار دوستوں اور رشتہ داروں نے یہ کہہ کر اُس کی ہمت بڑادی کہ وہ بھی کسی سیاسی لیڈر کے ہاتھ پر بیعت کرے۔یہ مشورہ سنتے ہی اُس کے بدن میں آگ سی لگ لگی۔وہ سوچنے لگا کہ آج تک ان سیاسی لیڈروں نے عوام کی خوشحالی کے لئے کونسا کارنامہ انجام دیا ہے۔ہمارے سماج میں بھوک،غریبی اور اقتصادی بدحالی کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔لیکن اُس کے جذبات تب سرد پڑ گئے جب وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔اُسے احساس ہورہا تھا کہ اب اُسے آخری انٹرویو دینا ہے اور بغیر سیاسی مدد کے اُسے نوکری نہیں مل سکتی ہے،اس لئے اُس نے اپنی خودداری کا گلا گھونٹ کر مجبوراً ایک سیاسی لیڈر کا ساتھ دے دیا۔الیکشن جیتنے کے بعد جب اُس نے سیاسی لیڈر کو اپنا وعدہ یاد دلایا تو وہ مکر گیا اوراس طرح سے وہ نوکری پانے کا آخری موقع بھی گنوا بیٹھا۔

اُسے لاچاری سے سخت نفرت تھی۔چند برسوں تک بے کار بیٹھنے کے بعد اُس نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑا۔کثیر تعداد میں لوگوں نے اُس کے حق میں ووٹ ڈالے لیکن نتائج آنے پر مسائل کے یزیدوں نے اُس کے آخری خواب کو بھی چکنا چور کرڈالا۔اعلان کرتے وقت کامیاب ہونے کے باوجود بھی اُس کے سر کو ناکامی کے تاج سے نوازا گیا اورایک مجرم کی طرح اُسے قید خانے میں بند کیا گیا۔

ایک عرصہ جیل میں گزارنے کے بعد جب وہ باہر آیا تو اُس کی تعمیری سوچ تخریبی لاوا میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک سلیم الفطرت انسان مکمل باغیانہ فطرت کا مالک بن چکا تھا۔ چند برسوں تک وہ خاموش رہا...... گاؤں سے دور...... اپنوں سے دور...... وہ سوچتا رہا...... حق تلفی اور ناانصافی پر سوچتا رہا...... اور اُس نے بدلا لینے کی قسم کھائی ...... ان مسائل کے جڑ کو کاٹنے کی قسم کھائی۔ وہ صرف خود سے مشورہ کرتا رہا کیونکہ اُس نے دوسروں کے تمام مشورے پہلے ہی قبول کر لئے تھے۔

اُس رات وہ بے چینی کے عالم میں ایک بھوکے شیر کی طرح اپنے کمرے میں چہل قدمی کرتا رہا۔ وہ سو نہیں پا رہا تھا کیونکہ اُس کی نیند پر مسائل کے یزیدوں نے کب کا شبخون مارا تھا۔ نئے دور کے یہ مسائلی یزید اقتدار پر قبضہ جمانے کے ساتھ ہی اپنے درباروں کو جنت نما بنا دیتے ہیں اور لوگوں کو مسائل کے کربلا میں جھونک دیتے ہیں۔ عوام کے بچے فرات کی ایک ایک بوند کے لئے ترستے رہتے ہیں اور ان کے بچے آبِ حیات سے بھی سیر نہیں ہوتے ہیں۔ وہ خود سے کہتا رہا کہ جدید دور کی یہ جمہوریت قدیم دور کی یزیدیت ہے۔...... چنگیزیت ہے...... سویرا ہوتے ہی وہ اپنے مشن پر روانہ ہوا۔ وہ اپنے آخری شکار کو ٹھکانے لگانے کے لئے چل پڑا۔ وہ شکار...... جس نے اُس کی مثبت سوچ کو منفی بنا دیا تھا...... جس نے اُس کی زندگی برباد کر ڈالی تھی۔ وہ جب جلسہ گاہ میں پہنچا تو جمہوریت کا علمبردار...... جمہوریت سے مرعوب مخلوق کے سامنے مکاری کے کرتب دکھا رہا تھا۔ وہ مائک پر گرج رہا تھا کہ ''وہ سماج کو غریبی، رشوت خوری، حق تلفی، بے انصافی اور دھنگا فساد کے خوفناک ماحول سے نجات دلائے گا۔'' لیڈر کی اس سیاسی بولی سے اُس کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اُس نے یہ سوچ کر سیاسی لیڈر کے سر کو کلاشنکوف کے نشانے پر رکھا کہ حقیقتاً اگر سماج سے غریبی، رشوت خوری، حق تلفی،

ناانصافی اور دھنگا فساد وقتل وغارت کے ماحول کو ختم کرنا ہے تو کیوں نہ ان برائیوں کو پھیلانے کے ریموٹ کنٹرول کو ہی ختم کیا جائے۔ چند ہی لمحوں کے اندر......ایک تیز رفتار گولی......لیڈر کی فسادی کھوپڑی میں گھس گی اور فسادی ریموٹ کے پرخچے اڑ گئے۔ اُس نے راحت کی سانس لی۔ لوگ افراتفریح کے عالم میں چاروں اور بھاگنے لگے اور وہ بھی اپنا آخری شکار کھیل کر لوگوں کے جنگل میں غائب ہو گیا۔



کالے پیڑوں کا جنگل

سورج ڈوبتے ہی بستی کے اندر کالے پیڑوں کا جنگل نمودار ہو جاتا تھا۔ ان کالے پیڑوں کی آدم خور شاخیں، آدم زاد کے قدموں کی آہٹ محسوس کرتے ہی آگ کے شعلے برسانا شروع کر دیتی تھیں اور جب اندھیری رات کا بھیانک سایہ بستی کے طول و عرض میں پھیل جاتا تو زندہ انسانوں کی چہکتی بستی شہر خموشاں کا نظارہ پیش کرتی تھی۔ خوف کے آسیب نے بستی کے پیر و جواں کے ذہنوں کو مفلوج بنا کے رکھ دیا تھا اور یہ لوگ طرح طرح کی نفسیاتی بیماریوں کے شکار ہو چکے تھے۔ کالے پیڑوں کی دہشت کی وجہ سے اندھیاری راتوں میں نہ کسی گھر میں روشنی چمکتی تھی اور نہ کوئی زبان اونچی آواز نکال سکتی تھی۔ لیکن! بچے...... معصوم بچے......اس خوف و دہشت سے نا آشنا...... جب کبھی ماں کی گود میں رونا شروع کرتے تو ماں سر کے آنچل سے اُن کے منہ کو بند کر کے رکھتی تاکہ باہر سے کوئی وحشیانہ دستک سنائی نہ دے۔ کوئی بھی انسان گھر سے باہر نکلنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا اور اگر کسی فرد کو مجبوراً گھر سے نکلنا پڑتا تو وہ آگ کے شعلوں کی نذر ہو جاتا۔ شب خون کا یہ سلسلہ اس بستی میں کئی دہائیوں سے جاری تھا۔

ایک منحوس رات جب تاجہ بیگم کے دودھ پیتے بچے کو اندھیرے میں بچھونے

ڈنک مارا تو وہ درد سے چیخنے لگا۔ بچے کو تڑپتا دیکھ کر رمضان چچا سخت پریشان ہو گیا۔ میاں بیوں نے اسپتال جانے کا مشورہ کیا۔ رمضان چچا نے لالٹین جلائی اور اسے ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکل آیا۔ وہ تاریکی میں روتے روتے اونچی آواز میں کالے پیڑوں سے فریاد کرنے لگا۔

"مجھے اسپتال جانے دو! میرا بچہ درد سے مر رہا ہے۔"

یہ سنتے ہی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور رمضان چچا کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کر ڈالا۔ تاجہ بیگم ابھی گھر سے باہر نہیں آئی تھی۔ اُن کے دوسرے بچے یہ اندوہ ناک منظر دیکھ کر نہ رو سکے اور نہ ہی تاجہ بیگم خاوند کی لاش کو دیکھ کر کچھ بول پائی۔ وہ رات بھر سسکیاں لیتی رہی اور پوہ پھٹنے کے انتظار میں تڑپتی رہی۔

صبح کے اُجالے میں جب بستی کے لوگ رمضان چچا کی لاش قبرستان میں دفن کرنے کے بعد واپس اپنے اپنے گھر کی طرف لوٹنے لگے تو ایک انجانی آواز نے ان کو روکا۔

"عقل کے اندھو کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ کب تک خود کو دھوکہ دیتے رہو گے؟ اگر اسی طرح آنکھیں بند کر کے اپنی تقدیر کو کوستے رہو گے تو وہ کالے پیڑ تم سبھوں کو ایک ایک کر کے ختم کر ڈالیں گے۔ ذرا ہوش میں آجاؤ، اپنی آنے والی نسل کے بارے میں سوچو۔"

سب لوگوں نے جب مڑ کر دیکھا تو صدیوں پرانے بلند قامت چنار کے گھنے سائے میں ایک بارعب نورانی چہرے والے خدا رسیدہ بزرگ کو باوقار اور پرسکون حالت میں پایا۔ تمام لوگ اس کے سامنے باادب کھڑے ہو گئے۔ بھیڑ میں سے ایک شخص نے جرأت کر کے بزرگ سے پوچھا۔

"حضرت! ہم لوگوں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"
یہ سنتے ہی بزرگ غضبناک آواز میں بول پڑا۔
"ارے نادانو! تمہاری آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑا ہے۔ میں تمہارا ماضی ہوں...... وہ شاندار ماضی، جس پر زمانے کو ہمیشہ ناز رہا۔ میں تمہاری تواریخ ہوں۔ وہ عظیم الشان تواریخ، جس کی مثال آج تک دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔"
بزرگ کے یہ پُر مغز الفاظ سُن کر تمام لوگوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ لوگوں نے جب بزرگ کو اپنی داستان الم سُنا کر اسے نجات حاصل کرنے کے لئے دُعا کی درخواست کی تو بزرگ نے جلال میں آ کر انھیں پھٹکارا۔
"یہ مصیبت تمہاری جرمِ ضعیفی کی سزا ہے۔ یہ تمہارے بُرے اعمال کا بدلہ ہے۔ تم ان کالے پیڑوں کے رکھوالوں کے سر پر اپنے ہاتھوں سے حاکمیت کا تاج رکھتے ہو۔ اپنے اسلاف کے اصولوں کے برعکس ان دوست نما دشمن حاکموں کے اصولوں کی آبیاری کرتے ہو۔ دماغ تمہارا اور سوچ ان کی۔ تم لوگ اپنے ایمان سے آنکھیں چُرا کر، اپنے ضمیر کو کچل کر ان کے ہاتھوں پر بیعت کرتے ہو اور انھیں برسوں تک مسند اقتدار پر بٹھاتے ہو۔ اگر تمہیں ان کالے پیڑوں کے شعلوں سے خود کو بچانا ہے تو ان کی ہیبت سے نکل کر اپنی راکھ میں چنگاریاں تلاش کرو۔ کیونکہ یہی چنگاریاں دہکتے شعلے بن کر ان کالے پیڑوں کے جنگل کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتی ہیں۔"
خزاں کا موسم تھا۔ بستی کے گرد و نواح کی پہاڑیوں کے اندر کا لاوا پھٹ پڑا اور سرد فضا، فضائے آتشین بن گئی۔ صدیوں پرانے چنار کے سُرخ مائل پتوں کو اپنے وجود کا احساس ہونے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پرسکون چنار، آتشِ چنار کا منظر پیش کرنے لگا۔



”ریاض توحیدی......اپنی کم عمری کے باوجود ایک گہری سوچ کے مالک ہیں جس میں عام انسان کا دُکھ بھی ہے اور ”انا پرست“ انسانوں کا انجام بھی۔ زیرِ نظر افسانے (تیسری جنگ عظیم سے قبل) میں انھوں نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ انسان کو لرزہ براندام کرنے کے لئے کافی ہے......!!“

(مرحوم عمر مجید۔ روزنامہ ”آفتاب“۔ کشمیر)

”......ان کی (ریاض توحیدی) اکثر کہانیوں کے کردار انسانی زندگی کی تلخیوں، اُلجھنوں اور ناکامیوں کی عکاسی کے ساتھ بہتر اور خوشحال مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ رنج وغم کی داستانوں میں وہ چراغ جلا جلا کر انسانی دلوں کی تاریکیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ آپسی بھائی چارہ پر زور دیتے ہیں۔“

(نور شاہ)

"جہانِ اقبالؔ" میں جھانکنے کا ایک اشتیاق کہیں یا تحقیق کی آبلہ پائی کا ذوق سفر ...... ریاض توحیدی کے ابتدائی ادبی اقدام اس بات کے غماز ہیں کہ اُن میں بہت کچھ کرنے کا جنون موجود ہے۔ اور یہ اُن کی پہلی شناخت ہے...... توحیدی افسانوں کے حوالے سے علامتوں کا دامن تھام لیں تو پھر علامتیں کتنی بھی آہ زاری کریں وہ اُن سے اپنی مطلب براری حاصل کئے بنا چھوڑنے والے نہیں اور اگر کبھی توحیدی صاحب پہ آسان، عام فہم، سادگی سے لبریز کہانی لکھنے کا موڑ بنا تو پھر کہانی تو کہانی بیانیہ بھی اتنا عام ہو جاتا ہے کہ لگتا ہے اب کے توحیدی عام لوگوں کو کچھ خاص سنانے جا رہے ہیں اور یہ بات سچ ہے کہ وہ علامتوں میں بھی ایک کہانی سامنے لاتے ہیں اور سادہ کہانیوں میں بھی ایک اچھی بات۔ کبھی وہ ادب برائے زندگی کے قائل نظر آتے ہیں اور کبھی ادب برائے انقلاب کے داعی بن کے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ بہر حال مجھے تو وہ اُن کے ہی پسندیدہ شاعر علامہ اقبالؔ کے اُس شعر کی تفسیر کے پیکر بننے کا شوق پالے ہوئے قلمکار دکھائی دیتے ہیں ؎

پلٹنا جھپٹنا جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

(زاہد مختار)

Kale Pedon Ka

By: *Dr. Riyaz*



نام : ڈاکٹر ... بٹ

قلمی نام : ڈاکٹر ریا...

ولدیت : غلام احمد بٹ

پتہ : خرمن وڈی پورہ ہندوارہ کشمیر

تعلیم : ایم ۔اے، ایم ۔فل ۔پی ۔ایچ ۔ڈی (گولڈ میڈلسٹ)

پیشہ : لیکچرر محکمہ تعلیم جموں وکشمیر

موبائل :۔ 9906834877

ای میل :۔ Drdeyaztawheedi@yahoo.com

پہلی تصنیف :۔ جہانِ اقبال (اقبالیات) ۲۰۱۰ء

Meezan Publishers

Opp. Fire & Emergency Services H/QRS, Batamaloo, Srinagar 190009 Kashmir

